راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 16 واں سال

ماہنامہ

# ارژنگ

لاہور

Monthly
# Arxang
Lahore

مدیر اعلیٰ: عامر بن علی

مدیر: حسن عباسی

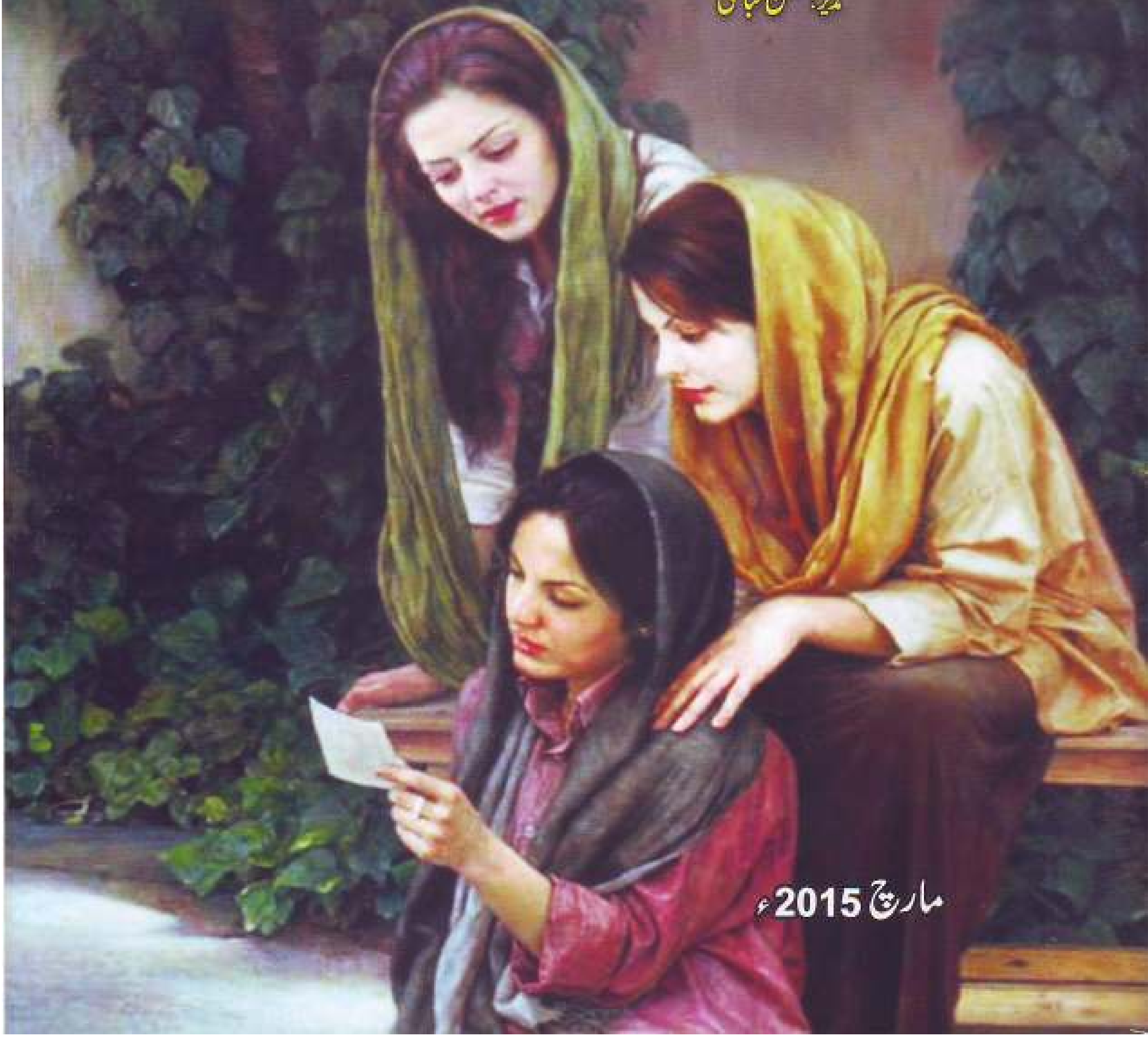

مارچ 2015ء

# جو لوگ گیت کو سمجھتے ہیں اُن کے لیے لکھنا مشکل اور جو نہیں سمجھتے ان کے لیے آسان ہے

سلسلہ یادِ رفتگاں

ممتاز ناول نگار، افسانہ نویس، شاعر، مترجم، محقق اور اردو ادب کے استاد

## احمد عقیل روبی (مرحوم) کی زندگی میں عامر بن علی اور ابرار ندیم کا ان سے انٹرویو۔

شاعر، فلمی کہانی کار، ناول نگار، ڈرامہ نگار، نقاد اور سوانح نگار احمد عقیل روبی کی شخصیت کی مختلف جہتیں ہیں۔ اگر ہم یہ سوال پوچھیں کہ احمد عقیل روبی کو پہچان کس خاص حوالے سے ملی تو اس کا جواب ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوگا۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ احمد عقیل روبی نے ادب کی جس صنف میں بھی لکھا پوری دیانتداری اور محنت سے اور اس معیار کا لکھا کہ فلمی گیت نگاری سے لے کر ناول نگاری اور تنقید تک ان کا ہر کام ان کی پہچان بن گیا۔

احمد عقیل روبی کے اب تک شاعری کے پانچ مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ ناولوں میں چوتھی دنیا، جنگل کتھا، بنجر دریا اور کچھا ور نام ہیں۔ اس کے علاوہ بے شمار فلموں کی کہانیاں، گیت اور ٹی وی کے لئے ڈرامے لکھ چکے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو جو خاص اعزاز بخشا ہے وہ ان کا قرآن پاک کے تیسویں پارے کا ترجمہ کرنے کا شرف ہے۔ احمد عقیل روبی اپنے کام کے معیار اور مقدار دونوں کے حوالے سے آج ادب میں ایک معتبر نام سمجھے جاتے ہیں۔

چٹان: شاعری کی ابتداء کب اور کیسے کی؟

احمد عقیل روبی: شاعری کا آغاز ۱۹۵۲ء میں ایک نظم لکھنے اور گرفتار ہونے سے ہوا۔

۱۹۵۲ء میں اعظم خان کا مارشل لاء لگا تو میں پانچویں جماعت کا طالب علم تھا۔ سکول میں دعا ترنم سے پڑھتا تھا۔ خانیوال جامع مسجد کے امام نے میری آواز سن کر ختم نبوت کے جلوس میں کچھ پڑھنے کے لئے مجھے بلوایا میں نے ساری رات جاگ کر ایک نظم لکھی:

آ ہوش میں جلسے میں نظم پڑھی تو ایک ہلچل سی مچ گئی۔ گرفتاریاں ہوئیں۔ مجھے بھی پکڑ لیا گیا ایک رات جیل میں رکھا۔ دوسرے دن سب کو ٹرک میں ڈال کر شہر سے ۴۰ میل دور جنگل میں چھوڑ دیا گیا۔ میں بھی ساتھ

> آپ باغ لگانے والے کو یہ کیوں کہتے ہیں کہ اس میں ایک ہی قسم کے پودے لگائے جائیں۔

تھا۔ پیدل چل کر روتے روتے شہر میں آیا۔ میری والدہ سخت پریشان تھیں۔ پریشانی میں میری پٹائی کی اور وعدہ لیا کہ آئندہ کسی جلوس میں نہیں جاؤں گا۔ میں نے جلوس میں نہ جانے کا تو وعدہ کر لیا لیکن شاعری ترک نہ کرنے کی قسم نہ کھائی اور پھر شاعری کی طرف قدم مسلسل بڑھتے گئے۔

> میں اُن تمام راستوں پر چلنا چاہتا ہوں جو میرے اندر پھیلے ہوئے ہیں

چٹان: شاعری میں آپ کن سے متاثر ہوئے؟

احمد عقیل روبی: میں شاید ابھی تک کوئی اچھا مصرعہ یا سطر نہیں کہہ سکا لیکن مجھے اس پر فخر ہے کہ میں نے اچھی سطریں اور اچھے شعر ضرور پڑھے ہیں۔ میں نے ہر زبان کے بڑے شاعر اور ادیب سے فیض حاصل کیا ہے۔ ہومر، ورجل، دانتے، ملٹن، شیکسپئر، فردوسی، میر، غالب، حسرت موہانی، فراق، ناصر کاظمی اور مجید امجد سے میں بہت متاثر ہوا ہوں۔

چٹان: آپ کو ڈائریکٹر کی ڈیمانڈ کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے۔ جبکہ شاعری آمد کی کیفیت میں ہوتی ہے۔ کیا ایسی شاعری جو تو اردو کے زمرے میں آئے اسے شاعری کہنا درست ہے؟

احمد عقیل روبی: جی ہاں میں نے فلم کے گانے لکھے ہیں۔ سید نور کی فلم چوڑیاں کے گیت بھی میں نے ہی لکھے لیکن چونکہ میری سید نور کے ساتھ ذہنی ہم آہنگی تھی اس لئے میں نے اس فلم کے گیت لکھے اور اس میں کامیاب بھی ہوا۔ لیکن مجموعی طور پر فلموں میں ناکام ہوا ہوں۔ دراصل اللہ تعالیٰ نے مجھے تخلیقی ذہن دیا ہے اور وہ گروہ جو آج کل فلمیں بناتا ہے تخلیقی باتیں سمجھنے سے قاصر ہے۔

مجھے فلمی گیت لکھنے کا شوق اس زمانے میں ہوا تھا۔ جب آرزو لکھنوی، شکیل بدایونی، قتیل شفائی، ساحر لدھیانوی اور گلزار جیسے نامور تخلیق کار فلموں کے گیت لکھتے تھے۔ یہ لوگ تخلیقی شاعری کرنے میں ایک اچھا مقام رکھتے تھے۔ ان لوگوں کے فلمی مصرعے بھی ادبی طاقت واہمیت رکھتے ہیں۔

(بقیہ اندرونی صفحات پر)

راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیرِ اہتمام مسلسل اشاعت کا 16 واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

ماہنامہ
# ارژنگ
لاہور

جلد نمبر ۱۷ • مارچ ۲۰۱۵ء • شمارہ نمبر ۳



مدیرِ اعلیٰ ⊙ عامر بن علی

مدیر ⊙ حسن عباسی

مدیرانِ اعزازی ⊙ ڈاکٹر صغرا صدف ⊙ ابرار ندیم ⊙ تن دیپ تمنا

نائب مدیران ⊙ قمر ریاض ⊙ خالد سجاد

مدیرانِ معاون ⊙ نازو کاڑوی ⊙ بدر سیماب

مدیرِ منتظم ⊙ علی رضا

مجلسِ مشاورت ⊙ احسان شاہد (برطانیہ) ⊙ ظفرا سلام (امریکہ) ⊙ سعدیہ سیٹھی (برطانیہ)

قانونی مشیر ⊙ کامران ناشط : 0300-8800339 سرکولیشن ⊙ شاہد عباسی

ارژنگ دوست ⊙ اینڈ بھلر (امریکہ) ⊙ ارشد شاہین (امریکہ) ⊙ اسعد رضوی (فرانس) ⊙ ارشد پرساحل (چین)

کمپوزنگ ⊙ زرتاب کمپوزنگ : 0321-4730769 ذوالفقار ⊙ نعمان حسن: 0333-4918383

آرٹ اینڈ گرافکس ⊙ محمد احسن گل : 0300-4529821



پتہ برائے خط و کتابت

**ماہنامہ ارژنگ**

F-3 الطیب سنٹر غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

حسن عباسی : 0300-4489310 نازو کاڑوی : 0301-4492133

nastalique786@gmail.com



سالانہ ممبرشپ

ڈاک خرچ (پاکستان) 1000 روپے • ڈاک خرچ بیرون ملک 5000 روپے

رابطہ : 0331-4489310 - 0300-4489310


## فہرست


حمد، نعت، سلام:

مضامین:

- نبیل صابری اور سخن کی جادوگر / بشریٰ رحمٰن ' ۳
- یاد سہاگن ہوئی / پنجابی: پروفیسر عاشق رحیل، اُردو: نازو کاڑوی ' ۵
- بابائے اُردو بازار / تنویر ظہور ' ۷
- شاعری کا نواب "حسن عباسی" / فرحت زاہد ' ۹
- فسونِ چشم کے کارے / علی اختر ' ۱۰
- قمر ریاض...... عمدہ شاعر اور بہترین دوست / حسن عباسی ' ۱۳
- تمکین سلیمانی کا خط / عطاء الحق قاسمی ' ۱۵
- پراسن "مزاجِ راہ" / گل نوخیز اختر ' ۱۷
- چھتی بوڑیں وے طبیبا / ابرار ندیم ' ۱۹
- عظیم کرکٹر / احمد سعید ' ۲۱

افسانے، سفرنامے: ☒ مجرم / اینڈ بھلر ' ۲۳

- خواب کی تعبیر / بی بی حلیمہ بشریٰ ' ۲۶
- خشک بیل پہ مرجھائی آنکھیں / شہزاد ملک ' ۲۸
- اسپورٹس گرل / دستگیر شہزاد ' ۳۰
- انکار / فیصل کچاہی ' ۳۳
- بے چارہ / تنویر صادق ' ۳۴

شعری گوشے: مختار جاوید، اقتدار جاوید، احمد ساقی، اطہر شکیل نگینوی، آفتاب احمد، جاوید آغا، حسن جمیل، فقیر سائیں، عابد کاظمی، ڈاکٹر اخلاق گیلانی، عزیر احمد ۳۷ تا ۴۷

شعری گوشے: لاہور، سیالکوٹ، بہاولپور، اوکاڑا، شیخوپورہ، بہاولنگر، ننکانہ صاحب، ٹیکسلا، بھکر ۵۳ تا ۶۱

متفرق شاعری ' ۶۲

تبصرہ کتب ' ۶۴

- نامہ ہائے احباب ' ۷۰



**Far East Marketing Co.**

Samaria Mansion 605 Koenji-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 166-0003 Japan
E-mail: femc1@hotmail.com

# حمد، نعت، سلام

## حمد

زندگی بھر کی ریاضت کا ثمر بخشا ہے
دستِ قدرت نے مجھے دستِ ہُنر بخشا ہے
جس کی چھاؤں میں رہوں، رزقِ مسلسل اُترے
تری رحمت نے وہ سرسبز شجر بخشا ہے
سیپ میں تو نے رکھا میری طلب کی خاطر
کیوں یہ سمجھوں کہ سمندر نے گہر بخشا ہے
اے جمیل اور حسیں! حسن عطا ہے تیری
کور چشموں کو اگر حسنِ نظر بخشا ہے
علم کی بھیک بھی مانگیں تو تجھی سے مانگیں
اس لیے تو نے ہمیں کاسۂ سر بخشا ہے
کائنات اس کے کسی کونے میں رکھ چھوڑی ہے
بے کراں ایسا مجھے دل کا نگر بخشا ہے
خوشبوئیں، ذائقے رکھے ہیں کئی رنگوں میں
اور مٹی کو عجب تو نے اثر بخشا ہے
کشتِ دل رنج سے بنجر نہ کہیں ہو جائے
آبیاری کے لیے دیدۂ تر بخشا ہے
تیری صناعی ہویدا تری تخلیق سے ہے
تو نے ہر چیز کو اندازِ دگر بخشا ہے

**واجد امیر**

## نعت بحضور سرورِ کونین

چادر تنی ہوئی ہے میرے سر پہ نور کی
مجھ کو طلب نہیں حریر و حور کی
چنتی رہی ہوں میں طیبہ کے باغ سے
خوشبو بسی ہوئی ہے میرے دل میں طور کی
صدیاں تیری زمانے تیرے حکمرانیاں
صلِ علیٰ کی روشنی ربِ غفور کی
پہنچی ہوں شہرِ طیبہ میں اب عمر بھر کے بعد
اس حاضری سے مل گئی دولت سرُور کی
حاجت روا کو سنتِ سرکار چاہیے
مجھ کو یقیں ہے ساتھ ہے رحمت حضورؐ کی
دامانِ مصطفیٰؐ میں کہیں بھی جگہ ملے
بارش ہے رحمتوں کی درودوں کی نور کی
قدموں میں تھی بچھی ہوئی کونین شاہ کے
بستر تھا صرف ایک چٹائی کھجور کی
ختم الرسل ہیں آپ نہ آئے گا اب کبھی
مریم کو مل چکی تھی بشارت حضورؐ کی
سارے جہاں پہ نور تیرا ابر اور ہوا
آنکھوں میں حیرتیں ہیں یہ عظمت حضورؐ کی
بیٹھی ہوں اب سنبھالے ہوئے دل فگاریاں
دریائے غم سے نکلی ہیں موجیں سرور کی
بسمل عطائے خاص شفاعت ہو روزِ حشر
دل میں بسی ہوئی ہے محبت حضورؐ کی

**بسمل صابری/ساہیوال**

## نعت ﷺ

نورِ ازل کی جلوہ گری چار سُو میں ہے
ہر گل کے، ہر شجر کے، ہر اک رنگ و بو میں ہے
مختارِ کل بنایا گیا حضورؐ کو
جو کچھ بھی ہے، حضورؐ ہی کی گفتگو میں ہے
جو کچھ ملے گا، آپؐ کے دم سے، کمال کا
ہر تشنہ لب کی آنکھ کا محور، سَبو میں ہے
ہر ولولہ جوان ہے، جذبہ سرُور بخش
لطف و کرم حضورؐ کا مرے لہُو میں ہے
خوشنودیٔ خدا کا وسیلہ حضورؐ ہیں
حرمت خدا کی، آپ ہی کی آبرو میں ہے
سب کچھ خدا نے آپ کو دل کھول کر دیا
ملتا ہے اُس کو، آپ کی جو جستجو میں ہے
آقا! بروزِ حشر سہارا ہو آپؐ کا
ہر آرزو کی جان، اسی آبرو میں ہے
گر آنکھ ہے تو دیکھ لے شہرہ حضورؐ کا
عرش و زمین و خلد بریں، کوبکو میں ہے
مجھ کو ریاضؔ مدحتِ خیرالوریٰ، شفا
قلب و نظر کا چین اسی مشکبو میں ہے

**سیّد ریاض حسین زیدی/ساہیوال**

## نعت

خدا کی بات کرو مصطفیٰؐ کی بات کرو
تم ابتدا سے اُسی انتہا کی بات کرو
ہوا ہے جلوہ فروزاں جہاں سے نورِ نازل
کرو جو بات تو غارِ حرا کی بات کرو
درِ نبیؐ پہ جو پہنچو تو زائرینِ کرام
کرم تمہارا جو اک بے نوا کی بات کرو
جو ہر مصیبت و کرب و بلا سے بچتا ہے
تو صرف ہونٹوں سے صلِ علیٰ کی بات کرو
ندیمؔ تم کو زبان و قلم ہوئے ہیں عطا
تو صبح و شام حبیبؐ خدا کی بات کرو

**ریاض ندیم نیازی/**

# بسمل صابری اور سخن کی جادوگر

بشریٰ رحمٰن

یہ تو کب کا طے پا چکا کہ بسمل صابری صاحبہ ایک خوش انداز اور خوش گلو شاعرہ ہیں۔ ان کی شاعری کے کمالات گنوانا تو مشکل ہے، مگر ان کی شاعری کی اثر پذیری پر بات ہوسکتی ہے۔

شاعر ہو، ادیب ہو یا کوئی بھی فن سے وابستہ شخص ہو اس کے مشہور اور ہر دلعزیز ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے کلام اور انداز میں انفرادیت ہو۔ دنیا نے ہمیشہ اس کو جانا اور پہچانا جو الگ سا نظر آیا...... منفرد نظر آیا۔ ممتاز نظر آیا اور جس کے کلام کی فسوں سازی نے زمانے کو چونکایا۔

یوں بسمل صابری صاحبہ...... جب بسم اللہ کا پیرہن اوڑھے صبر کے جھولے میں ہمک رہی تھیں انہیں شاعری ودیعت ہوگئی تھی۔ وہ دھیرج سے سج سج اس ڈگر پر پاؤں جماتی آ رہی تھیں کہ ان کی زندگی میں چونکا دینے والا وہ لمحہ آیا۔ جو ہر غیر معمولی شخص کی زندگی میں آتا ہے۔ 1960ء میں لاہور میں منعقد ہونے والے ایک انعامی مشاعرے کی صورت میں وہ لمحہ نازل ہوا اور بسمل صابری کو بسمل صابری بنا کے ان کی پوری زندگی پر محیط ہوگیا۔

پھر نہ ان کا راہوار خیال رُکا نہ قلم نے سانس لینے کی ضرورت محسوس کی۔ یہ خوبصورت اشعار کی خالق شاعرہ جذبوں اور جراُتوں کی شدتوں کے ساتھ گلگشت دوڑی...... گل رنگ وادیوں میں، درد کے جگنوؤں کی تلاش میں...... عشق کی منقش تتلیوں کی کھوج میں...... برستی بارشوں کے رم جھم کرتے موتیوں میں بھیگتی، گنگناتی،...... لو دیتی یادوں کے پیچھے پیچھے......

کیا کوئی شخص ایک روز یونہی دن چڑھے شاعر بن جاتا ہے......؟

نہیں...... شاعری کرنے کے لیے دل کو اندوہ کی جھیل بنانا پڑتا ہے...... کرب کی لہروں پر کنول کا ایک پھول اُگانا پڑتا ہے...... اس کنول کو محبت کہتے ہیں۔

محبت کا کنول درد واندوہ کی جھیل پہ کھلتا ہے۔ ہرا رہتا ہے۔

محبت کے پاؤں میں سدا ہجر کی پائل رہتی ہے...... جس کے اندر سوز وگداز بھرے زمزمے نکلتے رہتے ہیں! جو دلوں کے تار ہلاتے رہتے ہیں۔

محبت کی کوئی ایک شکل نہیں ہے۔ ہزار روپ ہیں اس کے، غم جاناں سے غم زمانہ تک...... اس سے نبرد آزما ہوئے بغیر پتہ ہی نہیں چلتا کہ دنیا کا چلن کس قدر انسانیت کش ہے۔ روپ کی بستی میں سڑوپ کتنے ہیں۔ رشتہ و پابندیاں کس کس موڑ پر آزار بن جاتی ہیں۔

یہ کیا ہوا کہ اتنی مسافت کے باوجود
اب دوستوں کے لب پہ بھی حرف دُعا نہیں
دنیا تیرے فراق کی تصویر بن گئی
اب تو تیرا خیال بھی اپنا لگے مجھے

بسمل صابری صاحبہ کی شاعری ہمہ گیر ہے۔

مگر مجھے اس میں جو بات اچھی لگتی ہے وہ یہ کہ ہر معاملے کے ساتھ معاملہ دل ساتھ چلتا رہتا ہے...... جو ذوق زندگی اور شوق بندگی کا مظہر ہے۔ علامہ اقبال نے بھی کہا تھا:

عشق نہ ہو تو شرع و دیں بت کدۂ تصورات

عشق مجاز سے عشق حقیقی تک...... کسک ہی کسک ہے، تڑپ ہی تڑپ ہے۔ ایک والہانہ خودسپردگی ہے۔ ایک عارفانہ پیاس ہے جسے بجھانے کی نہیں بڑھائے رکھنے کی تمنا رہتی ہے کہ یہی پیاس شاعری کے نخل کو اشکوں سے سیراب کرتی ہے:

لفظوں کی ردا اوڑھ کے نکلی تھی سفر پر
ہے اس میں میرے رب کی رضا یاد رہے گی

یہ رب کی رضا انہوں نے زندگی کے اصول ترتیب دیتے وقت سامنے رکھی۔ زندگی کہتی ہے بن مول میں کوئی شے نہیں دیتی۔ مجھے گزارو، مجھے بسر کرو، مجھے سر کرو، چاہے شاہ نشیں ہو یا گدڑی نشیں، فرقہ پوش ہو یا خلقت پوش...... زندگی خراج سے پہلے انسان کو تھکاتی ہے، بھگاتی ہے، آزماتی ہے، راہوں میں کانٹے بچھاتی ہے...... تب پھول چننے کی ادا بخش دیتی ہے۔ بسمل صابری ان تمام مرحلوں سے گزر کے زندگی کے میزان پر پوری اُتریں تو وہ باتیں کہنے کے قابل ہوگئیں جو ہر دل

کی آواز بن گئیں:

شبِ فراق سے رشتہ ہے پاسداری کا
مثالِ موجِ نفس تار تار پھرتے ہیں

میں نے تو اک چراغ ہواؤں میں رکھ دیا
جلتا رہا کہ بجھتا رہا یاد کچھ نہیں

رہنمائی جب سے تیری ملتفت نظروں نے کی
میری ہستی اس جہاں میں معتبر ہونے لگی

پائی ہے کب کسی نے یہاں منزلِ مراد
میری کہانی مفت میں بدنام ہو گئی

عام طور پر لوگوں نے محاورہ بنا رکھا ہے کہ اہلِ قلم قسم کے لوگ باعمل نہیں ہوتے۔ مگر بسمل صابری صاحبہ کی پوری زندگی کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اپنی ذاتی اور نجی زندگی ایک مجاہدانہ تب وتاب سے گزاری ہے۔ بلکہ کسب معاش کے مراحل ملی فرائض کے جذبے کے ساتھ طے کیے ہیں۔

چار خوبصورت بیٹوں کی احسن طریقے سے پرورش کی ہے اور انہیں عملی دنیا کے کامیاب انسان بنایا ہے۔ رشتوں ناتوں سے خوب نبھایا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ نسوانی وقار اور پندار کی چادر کا پلو سر سے سرکنے نہیں دیا۔ وہ ایک باکردار، باحیا اور باعمل شاعرہ ہیں۔

ایسی خواتین جو اپنی زندگی فن کی ترویج میں ایک مشن کی طرح گزارتی ہیں اور اپنے فرائض منصبی بھی پوری طرح ادا کرتی ہیں۔ وہ ایک رول ماڈل کی طرح ہوتی ہیں۔

ایسی عورتیں گو چھوٹے شہروں میں پیدا ہوتی ہیں مگر بڑے شہروں میں ان کے نام کی شامیں منائی اور سجائی جاتی ہیں۔ بسمل صابری صاحبہ نے بھی سستی پی آر اور عامیانہ ہتھکنڈوں سے ماورا ہو کر جہدِ مسلسل کی ڈگر پر اپنے فن کا سفر طے کیا ہے۔ تبھی شہرت ان کے دروازے تک خود چل کر آئی ہے۔ محترمہ بسمل صابری صاحبہ! ہم عورتوں کے لیے باعثِ فخر ہیں اور آنے والی نسلوں کے لیے قابلِ تقلید بھی۔ میری دعا ہے کہ باری تعالیٰ ان کے جذبِ دروں اور سوزِ گلو کو فکر و آگہی کی دنیا میں ہمیشہ سرسبز اور مہکتا دمکتا رکھے۔ آمین..... ان کے من کے آنگن میں یادوں کی برسات ہوتی رہے اور وہ کہتی رہیں:

بسمل بھگو گئیں تجھے یادوں کی بارشیں
بھولی ہوئی تھی جس کو وہ یاد آ گیا مجھے

## نعت

رحمتوں کا نزول ہوتا ہے
جب بھی ذکرِ رسولؐ ہوتا ہے

جو بھی ذکرِ حضور میں ڈوبے
رب کو بندہ قبول ہوتا ہے

جس کو ذکرِ نبیؐ نہیں بھاتا
راکھ ہوتا ہے دُھول ہوتا ہے

محفلِ نعت میں اگر مہکے
بس وہی پھول، پھول ہوتا ہے

شہرِ طیبہ میں موت کا آنا
زندگی کا حصول ہوتا ہے

سر کٹانا نبیؐ کی حرمت پر
اُمتی کا اصول ہوتا ہے

بدر سیماب / کویت

عجب نہیں کہ ترے آستاں کے ہوتے ہوئے
میں در بدر رہوں گنجِ اماں کے ہوتے ہوئے

وہ گل بدن مری آنکھوں میں جب سے آن بسا
کھلا ہوا ہے مرا دل خزاں کے ہوتے ہوئے

خیال آیا نہ اک دن بھی اپنے ہونے کا
میں بے نشاں ہی رہا جسم و جاں کے ہوتے ہوئے

یقین کر مجھے اب کچھ بھائی دیتا نہیں
ترے خیال، تری داستاں کے ہوتے ہوئے

بچا ہے کوئی کبھی گردشِ زمانہ سے
پناہ کس کو ہے آسماں کے ہوتے ہوئے

میں بامراد ہوں ہر گام پر اسی کے سبب
میں بے نیاز ہوں ہر اک سے ماں کے ہوتے ہوئے

یہ کیسے موڑ پہ لے آئی زندگی مجھ کو
ہے دشمنوں کی طلب مہرباں کے ہوتے ہوئے

قریب رہ کے بھی دیکھا ہے خود سے دور اُس کو
میں دھوپ کہتا رہا سائباں کے ہوتے ہوئے

میں اپنی ذات میں خود ہی سمٹ گیا ہوں رضا
شعورِ وسعتِ کون و مکاں کے ہوتے ہوئے

علی رضا

# یادسہاگن ہوئی

پنجابی: عاشق رحیل / اُردو، نازاوکاڑوی

''یادسہاگن ہوئی'' جناب اخلاق عاطف کا شعری مجموعہ ہے۔ اس کے بارے کوئی بات کرنے سے پہلے صاحب مجموعہ کی پنجابی زبان کے ساتھ والہانہ محبت کے بارے کچھ عرض کرنا چاہوں گا۔ وہ کہتے ہیں کہ میری خوش بختی یہ ہے کہ مجھے نثری اور تحقیقی حوالے سے پنجابی زبان کی خدمت کرنے کے مواقع نصیب ہوئے۔ اپنے تجربے کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ پنجابی بڑی لج پال زبان ہے۔ جو کوئی بھی ہو کسی بھی لہجے سے پیار کرتا ہے۔ یہ اس سے زیادہ اُس پر مہربان ہوتی ہے۔ اُسے عزت دیتی ہے اسے خوش آمدید کہتی ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم پنجابیوں کو بھی اپنی زبان سے پیار اور عزت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ میں اس سترتا، پوترتا اور مہربانیوں کو سلام کرتا ہوں۔

ہر ایک اُردو بولنے والے گھرانے میں پیدا ہونے والے انسان کی ہماری ماں بولی پنجابی کے لیے خدمات ہیں۔ میں ان کے جذبے کو سلام کرتا ہوں۔ اخلاق عاطف کو پنجابی زبان میں مٹھاس، لوچ اپنائیت اور گہرا پیار اس لیے ملا کہ یہ صوفیاء اور اولیاء کی گود میں پلی بڑھی اور اس میں وہ سارے گُن بھرپور ہیں، جو انسانوں میں انسانیت پیدا کرنے کے لیے ضروری ہوتے ہیں یہ پنجابی زبان کی خوش قسمتی ہے کہ اخلاق عاطف کو اس کی زلف سنوارنے کا خیال آیا۔ ان کی اُردو تحریروں کے معیار پر کوئی دوسری رائے نہیں دی جاسکتی اور اب ان کی پنجابی شاعری کی یہ دوسری کتاب ''یاد سہاگن ہوئی'' پہلے مجموعات کی طرح معیار کی بلندیاں چھوتی نظر آتی ہے۔ فن کی یکتائی معیار کی بلندی، لہجے کی گھلاوٹ اور خیالات کی پختگی اخلاق عاطف کے کلام کی نمایاں خوبیاں ہیں۔ ان کی شاعری جذبوں کی سچائی اور زندگی کی حیثیتوں کی ترجمان ہے۔ اخلاق عاطف نام ہی معیار کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

شاعر اپنے زمانے کا روشن مینار ہوتا ہے جس کی روشنائی لوگوں کو ان کی حیات سفر کی سیدھی راہ دکھاتی ہے۔ وہ معاشرے کا نقاد ہوتا ہے جس کے مشاہدے سے کوئی کمی، کوئی بے انصافی، بے اعتدالی اور بے راہ روی پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ وہ ایسا طبیب ہوتا ہے جس کی اُنگلیاں ہر وقت زمانے کی نبض پر رہتی ہیں اور وہ عوام کی دُکھ، تکلیف کی نشاندہی کرکے ان کے لیے علاج کے ساتھ دوا بھی تجویز کرتا ہے۔ ہمارے ادبی روشنی کے مینار اخلاق عاطف کے برجستہ، رواں اور سلاست کی خوبی سے مزین غزلیں، نظمیں اور گیت پڑھنے والوں کی رُوح کو سرشاری کا باعث ہو رہے ہیں۔ یہ غزلیں اُن تحقیق کاروں کے جواب بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ پنجابی زبان میں غزل نہیں لکھی جاسکتی۔ اس زبان میں یہ صلاحیت ہی نہیں کہ وہ غزل کا وہ بانکپن یا ناز نخرہ اُٹھا سکے۔ اُن کو ''یاد سہاگن ہوئی'' پڑھ کر اندازہ لگانا چاہیے کہ یہ صلاحیت زبان میں نہیں لکھنے والے میں ہونی چاہیے عاطف خود کہتے ہیں:

میری طبع غزل نوں اِنج بھاوندی اے عاطف
جویں سنگھنے دُکھ تے قبریں کونجاں دی ڈار

ان کے پاس مشاہدے کی گہرائی، وہ سُنی سنائی بات پہ یقین نہیں رکھتے۔ ان کا ایمان بڑھتی پر ہے۔

پڑھیا سُنیا ای نہیں عاطف اکھیاں نال وی تکیا اے
پانی روڑھ پیاس نوں دیندا ہا سا جتے عتاباں نوں

یہی وجہ ہے کہ ان کا قلم سے نکلا ہوا ہر شعر کسی بھی بناوٹ یا حقیقت سے دور کوئی بات نہیں ہوتی۔ شاعری وہی زندہ رہتی ہے جس سے کلام میں صدق بیانی اور احساس کی قدرت پائی جائے۔ چنانچہ اخلاق عاطف غزل کے روایتی مضمونات سے بچ کر نکلنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ وہ جو کچھ بھی لکھتے ہیں اُس میں کوئی نیا پن پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس کو جدت کہا جاتا ہے۔ جیسے:

ساہاں کندھاں لٹے ہوے سدیاں چھتاں ڈھونڈے دُکھ
دل گلی دے اجے جھیرے پیار پروہنے باقی نیں

..................

ٹھنڈیاں ہاواں کوسے اتھرو بھریا ویلا بولدا اے
عاطف بحث دلیل، گواہیاں، زنجیراں نہیں بولدیاں

اللہ تعالٰی نے جن انسانوں کو بے پناہ موزوں طبیعت اور تخلیقی قوت دے کے پیدا کیا ہے وہ دنیا ہی نہیں پوری کائنات کو اپنے نکتہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ رنگ مہکاروں، حسین نظاروں کے متلاشی رہتے ہیں۔ ان جیسے لوگوں میں سے کوئی مصور بن جاتا ہے تو کوئی سنگ تراش تو کسی کو شاعری کی فضا راس آ جاتی ہے۔

''یاد سہاگن ہوئی'' پڑھتے ہوئے کہیں بھی احساس نہیں ہوتا کہ کہیں غیر پنجابی کا کلام پڑھ رہے ہیں۔ کہیں بھی اُردو الفاظ کی آمیزش نظر نہیں آتی اور نہ ہی کہیں املاء کی غلطی کا احساس ہوتا ہے۔ جبکہ ہمارے پنجابی بھائیوں کی کتابوں میں غلطیوں کی بھرمار نظر آتی ہے۔ اخلاق عاطف معیار کو مقدار پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے پہلے مجموعہ ''ساویاں ونگاں'' اور پراگے ''یاد سہاگن ہوئی'' کے درمیان اٹھارا سال کا وقفہ ہے۔ آخر میں میں ان کی خدمت میں پنجابیوں بارے ایک شعر پیش کرنا چاہوں گا جو ہر پنجابی کے لیے باعث شرم ہونا چاہیے۔

پنجابیاں نے پہلاں پنجابیت نوں چھڈ یا
غیراں نے پھر عاطف ٹوٹے پنجاب کیتا

اور وہ اخلاق عاطف بن جاتا ہے اور کبھی کبھی ان کو اپنا روایتی محبوب بھی یاد آ جاتا ہے اور ان کے اندر رنگِ تغزل اُبھر آتا ہے۔

تکنا، سہنا، رُسنا یا غصے ہو جانا
اوہدی اِک اِک گل سی ستیاں کلاں جگاون والی

اخلاق عاطف محنت پر یقین رکھتے ہیں۔ بیٹھے رہنے یا ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر کسی بھی منزل پر نہیں پہنچا جا سکتا۔ عشق کی منزل کبھی بھی آسان نہیں رہی۔ اسی لیے روایتی عاشقوں کی طرح گھر میں بیٹھے ہی ظالم زمانے کے ظلم وستم کے خلاف فریاد نہیں کرتے اور نہ ہی اپنے قلم کا سارا زور گل وبلبل کے قصے یا فرضی محبوب کی مستی بھری آنکھیں اور کالی گھٹاؤں جیسی زلفوں کی تعریف کرنے میں نہیں لگا دیتے۔ وہ عمل کا درس دیتے اور کہتے ہیں:

کیہ کیہ گویڑ لائے کیہ کیہ حساب کیتے
اکھیاں نے پھیر کدھرے رنگلے نیں خاب کیتے

اس مجموعہ کے اکثر اشعار اخلاق عاطف کے عصری شعر اُن کی سیاسی، سماجی اور معاشی حالات پر گہری نظر کی نشاندہی کرتے ہیں اور اپنے دردکی منظوم تاریخ لکھ دی ہے۔

جے ماہی مری نیت اندر کھوٹ نہیں
پھکے پھکے رنگ نیں کیوں گلزاراں دے

یا

کل تے اَج چ فرق پیا اے کونفے توں وانگشن دا
اوہو ساڈیاں دھوناں غیر دیاں شمشیراں اوہو نیں

یہ جو آنکھوں سے خون ٹپکا ہے
دل کی کرچی کوئی چبھی ہوگی

..................

آج شدت سے تمہیں یاد کیا ہے دل نے
ہو سکے تو کوئی ملنے کا بہانہ کر لو

زاہد شمس/ملتان


## مزاح راہ

☆ علی رضا احمد کا شگفتہ وفکاہیہ مضامین پر مشتمل تیسرا مجموعہ

☆ بقول ضیاء الحق قاسمی کہ ''علی رضا احمد کے سامنے ایک وسیع میدان پڑا ہے۔ ان کی شائع شدہ تحریریں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک اچھے مزاح نگار بن چکے ہیں۔

اعلیٰ امپورٹڈ کاغذ قیمت 300 روپے خوبصورت سرورق سے آراستہ

## اُردو تحقیق صورتحال اور تقاضے

پروفیسر ڈاکٹر معین الدین عقیل

پاکستان کے نامور سکالر ڈاکٹر معین الدین عقیل کی اُردو تحقیق کی موجودہ صورت حال اور اسے درپیش مسائل سے آگہی پر عمدہ کتاب، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبا اور طالبات کی ضروریات کے لیے انتہائی ممد ومعاون

قریباً 5 صد صفحات قیمت: 700 روپے

## چولستان تاریخ وثقافت

چولستان کی تاریخ وثقافت کے حوالے سے اک اہم کتاب۔ اس خطے کے حکمرانوں، صوفیاء، اولیاء اللہ، فنکاروں، رسم ورواج، تاریخی عمارتوں سے روشناس کرایا گیا ایک مختصر مگر جامع کتاب۔

پروفیسر جاوید عثمان شامی کے قلم سے۔ قیمت 300 روپے

القمر انٹر پرائزز، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور

# بانی مسلم تعلیمی مجلس اور بابائے اُردو بازار

تنویر ظہور

میں نے 1959 کو مسلم ماڈل ہائی سکول لاہور میں چھٹی جماعت میں داخلہ لیا۔ 1964ء میں میٹرک کا امتحان اسی سال سے پاس کیا۔ میرے سکول کے کلاس فیلوز میں اسحاق ڈار اور سعید احمد شامل تھے۔ محمد اسحاق ڈار ان دنوں وفاقی وزیر خزانہ اور سعید احمد شامل تھے۔ محمد اسحاق ڈار ان دنوں وفاقی وزیر خزانہ اور سعید احمد ڈپٹی گورنر سٹیٹ بینک آف پاکستان ہیں۔ سکول کی عمارت کے اندر سامنے والی دیوار پر ایک پتھر نصب ہے جس پر سکول کے بانیوں کے نام کندہ ہیں۔ سب سے پہلا نام چوہدری برکت علی کا ہے۔ 1945ء میں مسلم ماڈل ہائی سکول کی بنیاد نواں کوٹ لاہور میں مسلم تعلیمی مجلس نے رکھی۔ اس مجلس کے منیجر چوہدری برکت علی تھے۔ مجلس کے دیگر عہدے داروں میں ملک نور الٰہی صدر، شیخ محمد اشرف، جنرل سیکرٹری اور نیاز احمد فنانس سیکرٹری تھے۔ چوہدری برکت علی اور شیخ نیاز احمد فنانس سیکرٹری تھے۔ چوہدری برکت علی اور شیخ نیاز احمد نے تعلیمی اداروں کے ساتھ ساتھ اشاعتی ادارے بھی قائم کیے۔ شیخ نیاز احمد نے شیخ غلام علی اینڈ سنز کے تحت کتابوں کی اشاعت کا کام شروع کیا۔ جبکہ چوہدری برکت علی 1929ء میں پنجاب بک ڈپو کے نام سے درسی کتب شائع کرنے کا ایک ادارہ قائم کیا۔ 1935ء میں چوہدری صاحب نے

''ادب لطیف'' کا اجرا کیا جو آج تک شائع ہو رہا ہے۔ 2015 میں ''ادب لطیف'' کی اشاعت کو 80 برس مکمل ہو جائیں گے۔ اس رسالے پر بانی کے طور پر چوہدری برکت علی کا نام شائع ہوتا ہے۔ جریدے کی چیف ایڈیٹر چوہدری برکت علی صاحب کی صاحبزادی صدیقہ بیگم اور ایڈیٹر محمد خالد چوہدری شامل ہیں۔ پہلا شمارہ چوہدری برکت علی اور طالب انصاری زیر ادارت چھپا۔ دوسرے شمارے میں چوہدری صاحب کے ساتھ میرزا ادیب کا نام چھپا۔

پنجاب بک ڈپو کے ساتھ ''ادب لطیف'' ادیبوں، شاعروں اور دانش وروں کا گڑھ بن گیا۔ یہاں ادبی محفلیں جمتیں۔ چوہدری برکت علی دل کھول کر رقم خرچ کرتے اور ادیبوں کی دعوتوں کا اہتمام کرتے۔ چوہدری برکت علی کے علاوہ ''ادب لطیف'' کی ادارت میں یہ شخصیات شامل رہیں۔ چوہدری نذیر احمد، فیض احمد فیض، باری علیگ، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، ناصر زیدی، عارف عبدالمتین، فکر تونسوی، ممتاز مفتی، احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین، سید قاسم محمود، ذکاء الرحمٰن، قتیل شفائی و دیگر پنجاب بک ڈپو کے تحت درسی کتب شائع کی جاتی رہیں۔ مسلم ماڈل ہائی سکول لاہور کے ہیڈ ماسٹر ایم اے عزیز تھے۔ ان کے بیٹے ڈاکٹر محبوب الحق وزیر خزانہ رہ چکے ہیں۔ مجھے

ایم اے عزیز کا شاگرد ہونے کا شرف حاصل رہا ہے۔ یہ ہر دلعزیز ہیڈ ماسٹر تھے۔ ایم اے عزیز نے سکول مجلہ ''نشانِ منزل'' میں اکتوبر 1968ء کے شمارے میں لکھا ''چوہدری برکت علی مرحوم ایک مخلص خادم اب نہایت معاملہ فہم تاجر، دوررس نگاہ رکھنے والے منتظم، انتھک سیاسی کارکن، صاف گو، خوددار اور دوست نواز انسان تھے۔ وہ محض ایک پبلشر اور تاجر ہی نہ تھے بلکہ ایک شریف النفس انسان بھی تھے۔ ان کے چند قیمتی اصول یہ تھے کہ محنت اور ایمانداری سے کماؤ مگر صرف اس قدر نفع ہو جائز ہو اور جس کے منافع سے عزت کی زندگی بسر ہو سکے۔ ان کا نصب العین سرمایہ نہیں بلکہ انسانیت تھا۔'' ''نشانِ منزل'' ہی سے میری ادبی زندگی کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلی میری تحریر ''نشانِ منزل'' میں شائع ہوئی۔ چوہدری برکت علی مرحوم کے تیسرے صاحبزادے محمد خالد چوہدری اپنے ذاتی اشاعتی ادارے چوہدری اکیڈمی اور پرانے ادارے پنجاب بک ڈپو کی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہیں۔ اردو بازار کے دکاندار اور تاجر محمد خالد چوہدری کو ''بابا اُردو بازار'' کے لقب سے مخاطب کرتے ہیں۔ چوہدری صاحب کے والد اور دیگر فیملی کے افراد کی اشاعتی خدمات کو سامنے رکھا تو محمد خالق چوہدری اس اعزاز کے بجا طور پر مستحق ہیں۔ میں جب بھی محمد

خالد چوہدری کو ملنے اُردو بازار جاتا ہوں تو میں نے دیکھا اردو بازار کا ہر تاجر اور دوکاندار ان کا بے حد احترام اور عزت کرتا ہے اس میں چوہدری برکت علی کی خدمات کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ محمد خالد چوہدری نے چوہدری اکیڈمی کے تحت ممتاز افسانہ نگاروں کے سو افسانے شائع کرنے کا اہتمام کیا جس کے تحت انہوں نے عصمت چغتائی کے سو افسانے، کرشن چند کے سو افسانے، منٹو کے سو افسانے، امرتا پریتم کے سو افسانے، پریم چند کے سو افسانے شائع کیے۔ اس کے علاوہ کلیات اکبرالہ آبادی، کلیات ابراہیم ذوق، کلیات اصغر گونڈوی، کلیات پطرس بخاری شائع کیں۔ محمد خالد چوہدری باغ و بہار شخصیت کے مالک ہیں۔ ان میں عاجزی اور درویشی پائی جاتی ہے۔ ملاقاتی کو یہ محسوس نہیں ہونے دیتے کہ ایک ممتاز پبلشر، سیاسی اور سماجی شخصیت چوہدری برکت علی کے صاحبزادے ہیں۔ اُردو بازار کی ہر دل عزیز شخصیت ہیں۔ آپ نہ صرف خوش گفتار اور خوش اخلاق ہیں بلکہ ادب اور ادیبوں کے بہت بڑے قدردان بھی ہیں۔ ادب کے بارے میں آپ کا وسیع مطالعہ ہے۔ خالد چوہدری نے ہمیشہ اعلیٰ اور معیاری ادب شائع کیا ہے۔ یہ اپنے نامور والد کے نام کی لاج رکھے ہوئے ہیں۔ چوہدری برکت علی کے دوستوں میں مرزا ادیب، عارف عبدالمتین، احمد ندیم قاسمی اور ابن انشا شامل تھے۔ یہ سبھی شخصیات محمد خالد چوہدری سے شفقت فرماتیں اور خالد چوہدری انہیں چچا کہہ کر مخاطب کرتے بعد میں ادیبوں کی نئی نسل محمد خالد چوہدری کے پاس ''چوہدری اکیڈمی'' آنے لگی۔ ان میں ڈاکٹر بلیغ الدین، ضیا ساجد، اظہر جاوید، انور جلال، یونس جاوید، زبیدہ سلطانہ اور غلام الثقلین نقوی شامل ہیں۔

❁❁❁

دور کس واسطے مجھ سے مرا سایہ ہوا ہے
ایسا لگتا ہے کوئی دل میں سمایا ہوا ہے
تیر اُس نے جو مری سمت چلایا ہوا ہے
لگتا ہے زہر کے قطروں میں بجھایا ہوا ہے
گھونسلوں میں جو پرندے نہیں واپس آتے
کسی ظالم نے کوئی جال بچھایا ہوا ہے
فاصلے رات کے اور دن کے مٹے جاتے ہیں
ہجر میں ہم نے عجب حال بنایا ہوا ہے
ناامیدی کی حقیقت بھی نظر میں رکھو
آس کا دیپ اگر دل میں جلایا ہوا ہے
کس نے ماضی کے جھروکوں سے صدا دی ہے مجھے
کس کا خط ہے جو مرے نام پہ آیا ہوا ہے
دوستوں کو میں بتاتا نہیں ہمراز اپنا
یہ سلیقہ مجھے دنیا نے سکھایا ہوا ہے
آج تو وصل کے وعدے پہ عمل کر ڈالو
چاند تو آج بھی کرنوں میں نہایا ہوا ہے
ایسی چاہت کا بھلا نام رکھیں کیا اختر
اپنا ہو کر بھی کوئی شخص پرایا ہوا ہے

حکیم سلیم اختر


مولانا حامد علی خاں کی یاد میں شاہد علی خاں کی زیرادارت شائع ہونے والا مجلّہ

# الحمراء

ادبی صحافت میں مقبولیت کے سنگِ میل عبور کرتا ہوا گزشتہ چودہ برس سے ہر ماہ باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے

اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے جنوری 2015 کا سالنامہ حاصل کریں

رابطہ کے لیے دفتر ماہنامہ الحمرا: j-24 ماڈل ٹاؤن، لاہور 0333-4001844

# شاعری کا نواب "حسن عباسی"

فرحت زاہد

لیجیے بہاولپور کی سوغاتوں میں ایک اور سوغات کا اضافہ ہوگیا۔ رنگ برنگے دھاگوں سے بنے خوبصورت کھیس، خواتین کے ہاتھوں کی دستکاریاں، اخروٹوں سے بنا مزیدار سوہن حلوہ، ستلج کا کنارا، چولستان کی ٹھنڈی اور پرسکون شامیں اور نواب آف بہاولپور کے زمانے کے شاہی انداز، بہاولپور میں وہ سب کچھ موجود ہے جو ایک چھوٹے سے شہر میں ہوسکتا ہے۔

حسن عباسی نے جب اپنی کتابیں تحفتاً مجھے دیں تو قطعاً اندازہ نہ تھا کہ یہ شاندار شاعر اور چونچال سفرنامہ نگار چولستانی مٹی کا پروردہ ہے اور وہ بھی بہاولپور سے اتنا ہی پیار کرتا ہے جیسے میں نیویارک میں بیٹھی روہی پر نظمیں لکھا کرتی تھی۔

اب تک مجھ میں شور مچائے چولستان کی شام
سانول تیری یاد دلائے چولستان کی شام

..................

جیون کے کچے رنگوں سے لے کر ایک پتنگ
پروائی میں اُڑتی جائے چولستان کی شام
(فرحت زاہد)

مجھ میں ایک اچھی عادت ضرور ہے کہ جب کوئی کتاب دے اُسے پہلی فرصت میں پڑھنا، خود پر لازم کرلیتی ہوں کہ یہ کتاب دینے والے کا حق ہوتا ہے اور لینے والے پر فرض۔ کتاب کے اچھے یا برے ہونے کا فیصلہ تو بعد میں ہوتا ہے۔

حسن کی تحریریں پڑھتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ یہ خود اپنے آپ کو پڑھواتی ہیں۔ قاری کو Push نہیں کرنا پڑتا اور کسی بھی تحریر کی سب سے بڑی خوبی اُس کی Read ability ہوتی ہے۔ حسن بہت سہولت سے شعر کہتا ہے اور ایک مکمل شاعر اُس کے وجود میں چھپ کر بیٹھا ہے۔ ایک بے ساختہ رومانس ہے، جو لہروں کی طرح اُس کی شاعری میں موجزن ہے۔

کبھی چولستانی آنکھیں اس کا رستا روکتی ہیں اور کبھی اُڑیسہ کا چاند اسے ہانٹ کرنے لگتا ہے اور کبھی ایزون کی مٹی دور تک اس کا پیچھا کرتی ہے۔ سفر کے راستے ہوں یا تخیل کی اُڑان، حسن کا تخلیقی جوہر پانی کی طرح اپنا راستہ بناتا ہے اور ہم اس کے وجدان کی اُنگلی تھامے ان دیکھے جزیروں کی سیر میں اُس کے ہم رکاب ہوجاتے ہیں۔

پھول بن کر کھلتا ہوں نادیدہ خطے میں کہیں
اور کسی انجان رستے میں بکھر جاتا ہوں

..................

ریت اُڑتی رہتی ہے مجھ میں ہزاروں سال تک
پھر اچانک ایک دن، سبزے سے بھر جاتا ہوں میں

..................

اجنبی دیسوں میں دونوں ملتے ہیں صدیوں کے بعد
ہاتھ اُس کا تھام کر جانے کدھر جاتا ہوں میں

حسن کو اپنی حیرتوں اور کم مائیگیوں کا اعتراف کرنے میں ذرا تامل نہیں۔ وہ جب ایک ننھے بچے کی حیرتی اور متجسس نگاہ سے اپنے گرد و پیش کو دیکھتا ہے تو حیرتوں کے سمندر سے اتنے موتی برآمد ہوتے ہیں کہ تھمنے میں نہیں آتے۔ وہ ان موتیوں کی لڑیاں پرو پرو کر ہمیں دے رہا ہے۔

میں کیوں نہ دیکھوں ہر اک شے کو اتنی حیرت سے
کہ اس جہان کے میلے میں پہلی بار آیا
اور پھر

صرف تیری آنکھیں ہی کھینچتی نہیں ہم کو
یہ زمیں پکڑتی ہے، آسماں بلاتے ہیں
برتنوں سے ہاتھوں کی خوشبوئیں نہیں جاتیں
خاک اُوڑھنے والے روز یاد آتے ہیں

درد کے بے سمت جنگلوں میں بھٹکنا اور دکھ کی بارشوں میں تنہائی اوڑھ کر بھیگتے رہنا تقدیر کے وہ سودے ہیں جن کی بھٹی میں کندن بن کر تخلیق امر ہوجاتی ہے۔

سارے میری آنکھیں دیکھتے رہ جاتے ہیں
آدھی بات بتاتا ہوں تو رو پڑتا ہوں
میں ہجرت کا عادی ہو نہیں پایا اب تک
جب سامان اُٹھاتا ہوں تو رو پڑتا ہوں
کیا کیا سورج، کیا کیا چاند گنوا بیٹھا ہوں
کوئی دیپ جلاتا ہوں تو رو پڑتا ہوں

اس غزل کو شاعر کی ذات سے ہٹ کر پاکستان کے سیاسی اور معاشرتی انحطاط کے تناظر میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

حسن کبھی تو چولستان سے "اک شام تمہارے جیسی ہو" کا سندیسہ لاتے ہیں اور کبھی "محبت کے پروں میں گھنٹیاں" باندھتے ہیں اور کبھی انہیں تتلیاں ستانے لگتی ہیں۔

تتلیاں بھلا حسن عباسی کو کیوں نہیں ستائیں گی کہ وہ خوش شکل بھی ہے اور خوش کلام بھی۔

میری دعا ہے کہ ان کی شاعری کا چمن یونہی کھلا رہے اور آنے والے ہر موسم کے ساتھ اُس پر ایک نئی بہار آئے۔ وہ دیس دیس کے سفرنامے لکھتا رہے اور ہمیں ان دیکھے جزیروں کے خواب دکھاتا رہے۔

مجھ کو خالی آنکھوں سے ڈر لگتا ہے
ان کو جھوٹے خواب دکھاتا رہتا ہوں

جیتے رہو حسن عباسی......اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

# فسونِ چشم کے کارے

علی اختر

لگتا کچھ یوں ہے کہ وہ اس کی سوچوں کے ہیروں پر اپنی چاہت کی ٹھوڑی ٹکائے بڑی دیر سے اُسے چپکے چپکے تکتی رہتی تھی۔ کبھی اشاروں کنایوں سے کبھی پیار کی کوئی کنکر اُچھال کے وہ اسے متوجہ بھی کرتی ہوگی۔ مگر وہ وسائل کے مسائل کی گتھیاں سلجھانے میں ایسا گم تھا کہ اس کی طرف آنکھ بھر کر نہیں دیکھتا تھا۔ مگر پھر بھی اک آس تھی، اُمید تھی کہ کبھی تو وہ بھی اس کی چاہت کی گلیوں میں بھٹکنے کو آئے گا۔ عشق عمر کے زنگ سے کبھی زنگارا نہیں جاتا۔ چاہت گزرتے سالوں اور گہنائے وقت کو نہیں دیکھتی۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ بڑھتی عمر اور گزرتے سالوں کی گرد اپنے جسم سے جھاڑتے ہوئے اُس نے سوچا کہ اب تک سوچوں کے ہیروں پر بیٹھی نار کے انتظار کی شدتوں پر خزاں اُتر آئی ہوگی۔ اس نے اچانک ایک روز اُس پر اپنی بھرپور نظر ڈالی تو وہ پھر سے جاگ اُٹھی۔

اُس نے اپنی چاہت کی چنری کا پلو دانتوں میں دبایا اور ہنستی مسکراتی جوانی سمیت چھم سے اس کے خیالوں کے آنگن میں اُتر آئی اور خمارِ عشق سے بھرپور لہجے میں بولی "صفدر جان! کب تک مجھ سے منہ موڑو گے، کب تک اپنا آپ مجھ سے چھپاؤ گے، میں تو تمہارے گھر کی باندی ہوں۔ کبھی تو میری طرف بھی دھیان دو اور میری فسونِ چشم کا نظارہ دیکھو۔" پھر صفدر ہنس دیا۔ جانِ صفدر نے اُسے اپنی بھرپور بانہوں میں لے لیا۔ وہ شاعری کی چھبیلی نار تھی۔ جس کی بانہوں کی کساوٹ میں صفدر ڈھلتی عمر میں بھی یوں کسا گیا کہ "نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن" کا معاملہ ہو کر رہ گیا۔ اس نے ربابِ عشق پر اپنی سوچوں کی اُنگلیاں ذرا سی چلائیں کہ شاعری کے جھلملاتے تارے اس کے اردگرد بڑی تیزی سے گرنے لگے۔ وہ کہہ اُٹھا:

میں تو بیٹھا تھا اکیلا غمِ ہجراں سے ملول
جانے کس وقت وہ چپ چاپ چلی آئی ہے

وہ اس کے خیالوں میں، اُس کی سوچوں میں اس طرح اُتری کہ شاعری کے محل کی ساری محرابیں دھنک سوچوں کی پچکاری سے سج گئیں۔ اس کی شاعری میں جوانی کی وہی عشوہ طرازیاں، وہی پھوٹتے عشق کی کونپلوں میں چھپا ہوا ساون، برہا کی چاندنی راتوں میں ٹوٹتی انگڑائیاں، غرورِ حسن، نخوت، بانکپن اور جمالِ ہم نشیں کی کہانیاں پھر سے لوٹ آئیں۔

عمر گزری ہے جواں سالی سے اس پیری تک
پھر بھی اس دل میں تلاطم سا رواں ہے کہ جو تھا

شاعروں کا گھرانہ ہو، والد حضرت جوہر نظامی (لوحِ محفوظ، وہم رسا، برج نور) حسن اختر جلیل (مقتل میں چراغ، یقینِ سحر) فرخ راجا (شہرِ طیب کے سائے میں) آفتاب حسین (جرسِ بے صدا زیرِ طبع، مرثیے امام عالی مقام مظفر حسن منصور (اک دور محبت بیت گیا) جیسے شاعروں کی کہکشاں اردگرد موجود ہو تو روشنی کی کرنوں سے کونے کھدرے بھی تو چمک اُٹھیں گے۔ صفدر حسن صفدر کے ساتھ بھی یقیناً ایسا ہی ہاتھ ہوا ہوگا۔ وہ اپنے شاعر بھائیوں کو تنگ کرتا اور ان کا مذاق اُڑاتا تھا۔ جیسا کہ وہ اپنے تعارف میں "کچھ اپنے بارے میں" میں لکھتا ہے:

"اس زمانے میں شعر نہیں کہتا تھا اور میں اپنے غیر شاعر بھائیوں کے ساتھ مل کر اپنے شاعر بھائیوں کے اشعار سننے کے لیے طرح طرح کے بہانے بنا کر اُن کو تنگ کیا کرتا تھا۔ جبکہ ان کو اپنے شعر سنانے اور داد وصول کرنے کی جلدی ہوتی تھی......!!"

پھر جب اس پر شاعری کا موسم اُترا تو اس کے بھائیوں نے اس کی طرف دزدیدہ نظروں سے دیکھا۔ ان کی نگاہوں میں استفہام تھا۔ ان کے اشاروں میں طنز تھا۔ مگر صفدر کی چالاکی دیدنی تھی۔ وہ شاعر کی کنہیا کی انگلی پکڑے ہوئے بھی بڑے دھڑلے سے کہہ رہا ہے:

یہ شاعری تو ہے بیکار مشغلہ صفدر
ابھی تو کتنے ہی کرنے ہیں تم کو اپنے کام

پوپ پال نے ایک بار شاعری پڑھ کر کہا تھا:

"میں شاعری کو مجسمہ حُسن کا رقص کہوں گا"

اس طرح صفدر حسن صفدر کی شاعری پر نظر دوڑائی جائے تو یہی حُسن اس کی شاعری میں جابجا نظر آتا ہے۔ اس نے اپنی شاعری کی دوشیزہ کو

مصنوعی حُسن نہیں دیا۔ تصنع کی ملمع کاری اور میک اپ سے شاعری کا چہرہ چمکانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ اس نے تو صرف سادگی سے شاعری کے خال و خد سنوارنے کی اک سعی کی ہے۔ شاعری میں ایسی سادگی کو سہل ممتنع کا نام دیا جاتا ہے۔ صفدر حسن صفدر کی فسونِ چشم کا اپنے پڑھنے والے پر پہلا ''کارا'' تو یہ ہوتا ہے کہ وہ اس مجموعہ کو بدقسمتی سے پڑھنا شروع کردے۔ تو پھر اسے ختم کیے بغیر نہیں رہا جاتا۔ لفظ بدقسمتی سے اگر کسی لمحے خار گزرے تو پیشگی معذرت کہ جب آسانی سے شروع کی جانے والی کوئی بھی چیز آپ کے پیچھے پڑ جائے تو آپ اسے کیا دم کریں گے۔ مثلاً جب وہ کہتا ہے:

میرے لیے تکلفات اتنے نہ تم کیا کرو
کچھ بھی نہیں ہے میرے پاس پھر نہ کہیں گلہ کرو

یا پھر:

حُسن نے واردات کر دی ہے
آنکھوں آنکھوں میں بات کر دی ہے

.......

سہل ممتنع کا ایک اور روپ:

بڑے ہمدرد ہوتے جا رہے ہو
انوکھے فرد ہوتے جا رہے ہو

.......

اک اور جگہ کہتا ہے

وہ اتنے لاڈ سے مجھ کو بلائے
ابھی اتنی بھی ارزانی نہیں ہے

صفدر حسن صفدر کا مجموعہ ''فسونِ چشم'' میں نے دیکھتے ہی اس لیے اُٹھانے کی جرأت کرلی تھی کہ اس نام سے گو بہت زیادہ نہیں مگر کچھ کچھ میری نسبت بھی قائم رہی ہے۔ حضرت جو ہر نظامی جب بھی فیصل آباد آتے تو حاتم بھٹی کے پاس ضرور آتے اور یہ اردگرد کے شعرا حضرات کا بھی مسکن اور ڈیرہ ہوا کرتا تھا۔ یہیں ان سے بھی ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ اسی ناتے سے صفدر حسن صفدر کا نام بھی میری شناسائی کی فائل میں ہمیشہ سے لگا ہوا تھا۔ میں نے کتاب اُٹھائی اور اگر اسے آپ مبالغہ نہ جانیں تو یہ حقیقت ہے کہ ان کی شاعری کا بانکپن، حسن کا پرتو، جمال ہم نشیں کے اشارے کنائے، نوجوانی کی گھاتیں اور وارداتیں اس عمر میں بھی ایک نیا لطف دے گئیں اور من ہی من میں کہہ اُٹھا:

یہ راجا صفدر خدا ہی جانے عجیب شے ہے
کہاں پہنچ کے کہاں کے قصے سنا رہا ہے

تب ہی مجھے پنجابی کا یہ محاورہ یاد آ گیا:

پتا پہ پوت پہ گھوڑا، بہتا نہیں پر تھوڑا تھوڑا

اور پھر سیانے یہ بھی تو کہتے ہیں کہ

''ہر چیز اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے''

اس مرحلے پر اگر اپنی عمر کی اس منزل پر آ کر صفدر حسن صفدر شاعری کی رادھا کو گلے لگاتا ہے تو کچھ عجب نہیں۔ کیونکہ شاعری تو اس کے گھر کی باندی رہی ہے۔ یہ ایک قاعدہ اور اصول ہے کہ جب کوئی مجرم اعتراف جرم کرلیتا ہے تو اس کی سزا میں کمی کر دی جاتی ہے۔ صفدر حسن صفدر نے بھی ''کچھ اپنے بارے میں'' یہ اعتراف کیا ہے:

''فسونِ چشم میری چار سالہ شعری کاوش کا نتیجہ ہے جس کے اشعار نہ کسی مشاعرے میں پڑھے گئے اور نہ کسی ادبی رسالہ میں شائع ہوئے۔ اس میں جمال ہم نشین، وصال یار، محبت کے فسوں، ہجر کے چرکے، دُکھ سُکھ، خوشی اور غم، دوستوں کی بے اعتنائی، اپنوں کی بیگانگی، رنج و الم، فطرت کی عکاسی، معاشرتی ناہمواریوں، ارتکاز دولت، ناانصافیوں اور محرومیوں، الغرض داخلی اور خارجی کیفیات اور محسوسات کی ایک جھلک موجود ہے۔''

حسن اور فسونِ چشم کے کارے بھی بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ یہ پل بھر میں انسان کو کیا سے کیا بنا دیتے ہیں۔ کبھی وہ رانجھا بن کر بیلے جا نکلتا ہے، کبھی فرہاد کا رُوپ دھار کر دودھ کی نہر نکالنے لگتا ہے، کبھی مجنوں بن کر گلیوں اور صحراؤں میں لیلیٰ لیلیٰ پکارتا ہے۔ یہ فسونِ چشم ہی تو ہوتا ہے۔ جو کبھی کبھی بندے کو رب سے بھی ملا دیتا ہے۔ صفدر حسن صفدر کو بھی اسی فسونِ چشم نے اپنے حصار میں لیا تو عمر کی بندشوں سے نکل کر وہ شاعر بن بیٹھا۔

نگاہوں سے لینا نشانے تیرے
وہ چرکوں پہ چرکے لگانے تیرے

.......

دیکھا جو اُس کو بام پر، اک عالم رہ گیا دنگ
بس ہالہ تھا اک نور کا، جو بدلے سو سو رنگ

صفدر حسن صفدر کی شاعری میں ہمیں ایک دوشیزہ بڑی خراماں خراماں چلتی نظر آتی ہے۔ یہاں مجھے والٹیئر (Voltair) کا کہا یاد آتا ہے کہ

''اگر شاعری کو ایسا مکان تصور کرلیا جائے جس کے پانچ کمرے ہوں، تو مجھے چار کمروں سے عورت کے چلنے کی آواز آتی ہے۔''

فسونِ چسم اس کی بھرپور گواہی ہے کہ صفدر حسن صفدر کی شاعری کا ہر شعر ایک نغمگی، اک حُسن اور جوانی کا الھڑپن لیے ہوئے ہے۔ صفدر حسن صفدر

کہتا ہے کہ اس کی شاعری میں داخلی اور خارجی محسوسات وکیفیات کی ایک جھلک موجود ہے جس کا بین ثبوت یہ ہے کہ جب بچہ ذرا سا بڑا ہو جاتا ہے اور چلنے پھرنے لگتا ہے تو سب سے پہلے اپنے ننھے ننھے پاؤں میں اپنے بڑوں کے جوتے پہن کر فخر سے بزرگوں کو دکھاتا ہے اور داد لیتا صفدر حسین صفدرؔ نے بھی اپنی شاعری کو ننھے قدموں سمیت پور پور چلنا سیکھا تو اپنے بڑوں کو دیکھتے ہوئے کہہ اٹھا:

لکھ کے مانوس زمینوں میں غزل صفدرؔ جی
چاہتے ہو کہ بزرگوں میں شمار آ جائے

وونٹ کٹ انداز میں دوسروں کو خاموش دیکھ کر اپنے آپ کو بڑا اس طرح ثابت کرتا ہے:

اب مان رہے ہیں سارے صفدرؔ بھی شاعر ہے
جب ہنسی مذاق میں اس نے کیا سب کا قافیہ تنگ

تبھی تو میں کہتا ہوں کہ لگتا یوں ہے کہ وہ اس کی سوچوں کے بیروں پر اپنی چاہت کی تھوڑی نگاہ بڑی دیر سے اُسے چپکے چپکے سے تکتی رہتی تھی اور جونہی اسے موقع ملا تو وہ چھم سے اس خیالوں کے اور سوچوں کے کھلے دروازے سے اس کے من آنگن میں اُتر آئی۔ تب صفدرؔ کے چاہنے والوں نے اس پر پھبتیاں کسنے کی تیاریاں کیں تو صفدرؔ فوراً انجان بن گیا۔ ہر اس چڑھتی عمر میں گرم و نرم سانس لینے والے لڑکے یا لڑکی کی طرح، عشق جیسی چوری چھپی گھاتوں کو بزرگ استفہامیہ نگاہوں سے دیکھتے تو وہ لڑکا یا لڑکی اس سے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے اُلٹا پوچھتا ہے ''آپ کس کی بات کرتے ہیں، اچھا اُس کی بات کرتے ہیں!''

صدر کا انداز بھی دیکھئے:

جھانکتے تھے جہاں سے نین کنول
ان بیروں کی بات کرتے ہو

بزرگ تحیر زدہ ہو کر اس کے انداز کو دیکھتے ہیں ان کی طرف سے بھی صفدرؔ خود رہتا ہے:

بدل بدل کے میں کرتا رہا سوال اس سے
مگر تھا اس کے لبوں پر جواب اب بھی وہی

بہر حال فسونِ چشم خاصے کی شے ہے۔ اس کو پڑھ کر فوری طور پر یہ کہنے کو جی چاہتا ہے:

اس عمر میں یہ کرتوت
جوہرؔ نظامی کے لاڈلے پوت

اگر لفظ ''کرتوت'' کچھ بھاری لگے تو معذرت کے لیتے ہیں۔ مگر حقیقت یہی ہے اگر کچھ جھوٹ لگے تو پیسے واپس!!


ممتاز شاعرہ اور کالم نویس
ڈاکٹر صغرا صدف کے شعری مجموعے
''وعدہ''
کا تیسرا ایڈیشن نہایت خوبصورت
انداز میں شائع ہو گیا ہے
ناشر
نستعلیق مطبوعات
الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور
0300-4489310 / 0423-7351963

برطانیہ میں مقیم ممتاز شاعرہ
ناول نگار، کالم نگار، افسانہ نویس
ریڈیو کمپیئر اور ٹی وی اینکر
سعدیہ سیٹھی کی کتب
① کبھی ناراض مت ہونا (شعری مجموعہ)
② پہیلیاں (شعری مجموعہ)
③ محبت آخری سچ ہے (ناول)
④ مشرق کی خوشبو (افسانے)
⑤ پہیلیاں (انتخاب)
نستعلیق مطبوعات
الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور
0300-4489310 / 0423-7351963

لاہور میں مقیم معروف شاعر
ایم شاہد بیگ کے شعری مجموعے
میری فکر، میرا جہاں
میزانِ خرد و جنوں
مکمل اہتمام کے ساتھ شائع ہو گئے ہیں
ناشر
نستعلیق مطبوعات
الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور
0300-4489310 / 0423-7351963

# قمر ریاض......عمدہ شاعر اور بہترین دوست

حسن عباسی

مجھ سے جب بھی کوئی یہ سوال کرتا ہے کہ شاعری کا حاصل کیا ہے تو ہر بار میرا ایک ہی جواب ہوتا ہے کہ وہ چند دوست جو مجھے شاعری کے وسیلے سے ملے اس جواب پر مجھے کبھی شرمندہ ہونا یا پچھتانا نہیں پڑا۔ کیونکہ اس فہرست میں کچھ عرصہ بعد کسی نہ کسی نام کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ قمر ریاض بھی میرے ان دوستوں میں سے ہے جو شاعری کا حاصل ہیں۔ ایک مشاعرے میں مختصری ملاقات کے بعد ہم دونوں کی غالباً یہی کیفیت تھی:

اس سے بڑھ کر اور تعارف کیا ہوگا<br>
پہلی بار ملے ہیں اور انجان نہیں

پہلی نظر میں تو وہ مجھے شاعر بالکل نہیں لگا۔ اُسے دیکھ کر کسی فلمی ہیرو کا گمان ہوا۔ مگر جب اُس نے اپنی شاعری سنائی تو مجھ سمیت مشاعرے میں موجود سب لوگوں کو اپنا اسیر کر لیا۔ یہ ہنر کسی کسی کے پاس ہوتا ہے۔ گاہے بگاہے باہر کے ممالک سے لاہور آنے والے ڈھیروں شاعروں میں معدودے چند شعراء ہی ایسے ہوتے ہیں جن کا کلام سن کر ''آہ'' کی بجائے ''واہ'' کہنے کو جی چاہتا ہے۔ اُن میں ایک قمر ریاض ہے۔ اُس کا پہلا شعری مجموعہ ''جیون، تتلی اور میں'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ یہ شعری مجموعہ ابھی مجھے تو نہیں ملا۔ البتہ اس کی شاعری مختلف ادبی جرائد میں میری نظر سے گزرتی رہی ہے۔ خاص کر ماہنامہ ارژنگ کے لیے جب مجھے اس کی غزلیں اور نظمیں موصول ہوئیں تو وہ مجھے اتنی پسند آئیں کہ میں نے انہیں ایک گوشے کی صورت میں شائع کیا۔ پاکستان اور مسقط میں قمر ریاض کو میں نے چند مشاعروں میں سنا اور ہر مشاعرے میں اس نے بھرپور داد سمیٹی۔ وہ سوشل کلب آف عمان کی لٹریری ونگ کا جنرل سیکرٹری ہے۔ مسقط میں عالمی سطح کے مشاعروں کی نظامت وہی کرتا ہے۔ تقریب کی کامیابی اور خوبصورتی میں بحیثیت منتظم اور کمپیئر اُس کا کافی اہم کردار ہوتا ہے۔ عموماً نظامت کرنے والے شاعر کو کم داد ملتی ہے۔ کیونکہ لوگ ناظم کو نہیں بلکہ شعراء کو سننے کے لیے آئے ہوتے ہیں اور اس لیے وہ ذہنی طور پر داد دینے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے۔ مگر قمر ریاض کا معاملہ اُلٹ ہے اس نے ہمیشہ بھرپور داد وصول کی اس کی شاید ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اچھا شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اپنی دل پذیر شخصیت کی وجہ سے نہ صرف حلقہ یاراں بلکہ مسقط کی پاکستانی کمیونٹی میں بھی خاصا مقبول ہے۔

شعراء کی ادبی حلقہ بندیوں میں ان کے شعری مزاج کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ ابتدا میں ہر شاعر اپنے قریبی حلقے کے اسلوب سے بڑا متاثر ہوتا ہے اور اُس رنگ میں شاعری کرنے لگتا ہے۔ وہ اپنے حلقے کے شعرا کے کلام سے اتنا متاثر ہوتا ہے کہ انہیں میرؔ و غالبؔ سے کم حیثیت نہیں دیتا اور اس کے نزدیک وہ نادر و نایاب لوگ ناقدریٔ زمانہ کا شکار ہوتے ہیں۔ ایک جیسا شعری مزاج رکھنے والے شاعر فطری طور پر ایک دوسرے کی طرف راغب ہوتے ہیں اور ان کا خود بخود ہی ایک حلقہ بنتا چلا جاتا ہے۔ یہاں بھی وہی مشکل درپیش آتی ہے کہ ایک حلقے کے شعراء دوسرے حلقے کی شاعری کو شاعری ہی نہیں گردانتے اور دونوں حلقے یہ فریضہ مکمل نیک نیتی سے سرانجام دے رہے ہوتے ہیں۔ حالانکہ دونوں حلقے اچھی شاعری کر رہے ہوتے ہیں فرق صرف شعری تربیت، مزاج اور صلاحیت کا ہوتا ہے۔ ایسی ہی صورت حال سے غزل اور نظم کے مخالفین ہمیشہ دوچار رہے ہیں۔ اس ساری تمہید کا مقصد یہ باور کرانا تھا کہ قمر ریاض سے دوستی کا ایک بنیادی فیکٹر یہ بھی ہے کہ فطری طور پر ہم ایک مزاج کے شاعر ہیں۔ اُس کا رجحان بھی رومانویت کی طرف زیادہ ہے۔ فطرت کے مناظر اور امیجری سے اُس کی شاعری ترتیب پاتی ہے۔ وہ آسان شگفتہ اور سلیس زبان میں شاعری کرتا ہے۔ اُس کی شاعری پڑھتے ہوئے قاری کو کہیں بھی نہ تو بوجھل پن کا احساس ہوتا ہے اور نہ ہی وہ ابلاغ کے مسئلے سے دوچار ہوتا ہے۔ ایسی شاعری ہی مقبول ہوا کرتی ہے اور پڑھنے والوں کی ذہنوں میں محفوظ رہا کرتی ہے۔ رہا بڑے کینوس کی شاعری کا سوال تو وہ ابھی قمر ریاض نے کرنی ہے ابھی اس کے شعری سفر کی ابتدا ہے اور یہ ابتدا یہاں بہت سے شاعروں کی انتہا سے کہیں بہتر ہے۔ قمر ریاض کی میں نے پنجابی شاعری بھی سنی ہے اور اس کا میں بہت زیادہ معترف ہوں۔ کیونکہ اس میں اس کا لہجہ اور مزاج نہایت منفرد ہے۔ اگر وہ پنجابی میں اپنی شعری صلاحیت کا ادراک کر کے مکمل سنجیدگی سے شعر کہے تو پنجابی ادب کو شاہکار تخلیقات دان کر سکتا

ہے۔ قمر ریاض ایک دل پذیر شاعر، بہترین دوست، بہت اعلیٰ منتظم، جاندار کمپیئر اور سراپا محبت شخص کا نام ہے۔ میں قمر ریاض کی محبتوں کا ہمیشہ مقروض رہوں گا۔ آخر میں اس کی شاعری میں سے کچھ نذرِ قارئین:

عشق میری حیات ہو جیسے
یہی کل کائنات ہو جیسے
وہ سمجھتا ہے بھول جاتا مجھے
عام سی کوئی بات ہو جیسے
ایسا لگتا ہے زندگی کا سفر
کوئی لمبی سی رات ہو جیسے
دل کے یوں ٹوٹنے سے لگتا ہے
ہو گئی میری مات ہو جیسے
میں کہاں اور وہ کہاں ہے قمر
پھر بھی لگتا ہے ساتھ ہو جیسے

**جیون میں اور تتلی**

بچپن میں اک تتلی دیکھی تھی
اور چھو لینے کی ضد میں ہم نے
گھر کی دہلیزوں کو پار کیا تھا
آج اس ضد سے ہار گئے ہم
گھر کا رستہ بھول گئے ہم
تتلی کو معلوم نہیں ہے

**کہانی کی موت**

سنتے تھے ہم بچپن میں
اک بڑھیا چاند پہ رہتی ہے
اور چرخہ کاتتی رہتی ہے
سنتے ہیں اب لوگوں سے ہم
ایک انسان نے چاند پہ جا کر
اس بڑھیا کو مار دیا ہے!

**گہرا دکھ**

شب بھر سوچا
اور کاغذ پر
لکھا کچھ بھی نہیں
بس اتنا ہی میں نے دیکھا
کاغذ بھیگ چکا تھا!


حسن اور حکومت سے کون جیت سکتا ہے
یہ بتاؤ دونوں کی عمر کتنی ہوتی ہے
ممتاز شاعر، کالم نویس، مترجم اور
ماہنامہ ''ارژنگ'' کے مدیرِ اعلیٰ
عامر بن علی کی کتب کے
نئے ایڈیشن مکمل اہتمام کے ساتھ شائع ہو گئے ہیں
① چلو اقرار کرتے ہیں (شعری مجموعہ)
② سرگوشیاں (شعری مجموعہ)
③ ''محبت چھو گئی دل کو'' (شعری مجموعہ)
④ گفتگو (انٹرویوز)
⑤ آج کا جاپان (کالم)
⑥ محبت کے دو رنگ (تراجم)
ناشر
نستعلیق مطبوعات
الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور
0300-4489310 / 0423-7351963



ممتاز کالم نویس
رئیس عباس زیدی کی کتب
① شام و سحر کے درمیاں (آپ بیتی)
② سلسلۂ روز و شب (کالم)
③ قرآنی دعائیں (انتخاب)
ناشر
نستعلیق مطبوعات
الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور
0300-4489310 / 0423-7351963



جوہر آباد میں مقیم ممتاز شاعر اور
جوہر نظامی (مرحوم) کے فرزند
مظفر حسن منصور کا شعری مجموعہ
اک دورِ محبت بیت گیا
مکمل اہتمام کے ساتھ شائع ہو گیا ہے
ناشر
نستعلیق مطبوعات
الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور
0300-4489310 / 0423-7351963



سیالکوٹ میں مقیم نوجوان شاعر
صدق فقیر کا پہلا شعری مجموعہ
مسکراہٹ زندگی ہے
شائع ہو گیا ہے
ناشر
نستعلیق مطبوعات
الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور
0300-4489310 / 0423-7351963

# غمگین سلیمانی کا خط

عطاء الحق قاسمی

پیارے عطا!

ان دنوں شہر میں شادیاں بہت ہو رہی ہیں۔ اس لیے تمھارے خط کا جواب جلدی نہ دے سکا۔ شہر میں جس طرف نکل جائیں قناتوں اور سائبانوں سے رستہ بند ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے لمبا چکر کاٹنا پڑتا ہے۔ پھر ان دنوں کوئی بارات بینڈ باجے کے بغیر مکمل نہیں ہوتی اور یوں شور وشغب سے کانوں کے پردے پھٹے جاتے ہیں۔ اوپر سے دولہا نے چہرے کو سہرے سے چھپایا ہوتا ہے جس سے مجھے سخت وحشت ہوتی ہے کس قدر احمقانہ رسم ہے خدا جانے ہم لوگوں کو کب عقل آئے گی۔ میں تو ہر وقت اس خیال سے پریشان رہتا ہوں کہ ہم لوگ ہر وقت خوشیوں کے پیچھے کیوں دوڑتے رہتے ہیں۔ حالانکہ ہم سب نے ایک روز مرنا ہے۔ چنانچہ اس دنیا کے چند روز ہم اگر ہنسی خوشی بسر بھی کرلیں تو کیا فائدہ۔ بالآخر مرنا تو ہے کل میرے بچے کی سالگرہ تھی۔ بہت سارے لوگ گھر میں جمع تھے۔ کیک کاٹا گیا۔ پھر تالیاں بجائی گئیں میری بیوی جو ایک بیوقوف سی عورت ہے سب سے زیادہ خوش نظر آرہی تھی اور فرط مسرت سے بچے کو بار بار چوم رہی تھی۔ میں یہ سب خاموشی سے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ ہم لوگ کدھر جا رہے ہیں۔ آخر ہمیں موت کیوں یاد نہیں۔ یہ خوشیاں دائمی نہیں ہیں' کیا فائدہ ان چیزوں کا کہ بالآخر ہم سب نے تنگ و تاریک قبر میں لیٹنا ہے۔ مگر ہم لوگ یہ سب کب سوچتے ہیں' یہاں میرے دفتر میں جتنے لوگ ہیں' سب بے فکر ہیں' لنڈے کے کپڑے پہنتے ہیں' بسوں میں دھکے کھاتے ہیں' غلیظ اور تنگ گھروں میں رہتے ہیں غربت' افلاس اور بیماری نے ان کا ناطقہ بند کیا ہوا ہے۔ مگر دفتر میں آتے ہیں تو سب کچھ بھول کر قہقہے لگانے میں لگے رہتے ہیں۔ مجھے تو ان لوگوں کو دیکھ کر بہت غصہ آتا ہے انہیں چاہیے کہ اکٹھے بیٹھیں تو ایک دوسرے کے دکھ سکھ بلکہ صرف دکھ پھرولیں اگر ان کے دل غموں سے بھرے ہوئے ہیں تو ان کے چہروں پر بھی دکھ کی پرچھائیاں ہونی چاہئیں مگر یہ سب لوگ جھوٹے قہقہے لگا کر یہ سمجھتے ہیں کہ یہ جوانمردی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ بھلا یہ کہاں کی جوانمردی ہے اور اگر جوانمردی ہے بھی تو اس جوانمردی کا کیا فائدہ کہ ایک روز بالآخر سب کو مر جانا ہے میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں یہ زندگی اسی طرح گزارنی چاہیے جس طرح قبر میں لیٹ کر گزارنی ہے تاکہ ہم اس زندگی کے عادی ہوسکیں جو اس چند روزہ زندگی سے کہیں زیادہ طویل ہے چند روز پیشتر میں نے دیکھا کہ ایک شخص اپنے بچے کی بے معنی سی حرکتیں دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا حالانکہ اس میں خوش ہونے والی کوئی بات نہیں تھی اور اگر تھی بھی تو خوش ہونا کون سی کوئی ایسی بات ہے کہ خوانخواہ خوش ہوا جائے میں تو روزانہ صبح اٹھتے ہی زندگی اور موت کے مسئلے پر سوچنا شروع کرتا ہوں' ناشتے کی میز پر بھی دنیا کی بے ثباتی پر غور کرتا ہوں اور رات کو سونے سے پہلے ایک دفعہ پھر موت کا منظر یاد کرتا ہوں۔ میں نے ان دنوں میں خواجہ اسلام کی معرکۃ الآرا کتاب ''موت کا منظر مع مرنے کے بعد کیا ہوگا'' بھی پڑھی میرے خیال میں یہ کتاب پہلی جماعت سے بچوں کو پڑھانی چاہیے سبحان اللہ کیا عمدہ کتاب ہے' جب سے پڑھی ہے زندگی کی جو تھوڑی بہت رمق میرے اندر موجود تھی وہ بھی ختم ہوگئی

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

تمھیں لٹریچر سے بہت دلچسپی ہے۔ جبکہ تم جانتے ہو مجھے لٹریچر سے کبھی شغف نہیں رہا لیکن گزشتہ دنوں میں نے اردو کے کلاسیکی شعرا کا ایک انتخاب دیکھا تو اردو ادب سے مجھے بھی دلچسپی پیدا ہوگئی' موت پر ان شاعروں نے کیا کیا شعر کہا ہے' خواجہ اسلام کی کتاب اور اردو کے ان شعرا نے میری زندگی پر بہت گہرا اثر ثبت کیا ہے' چنانچہ اب زندہ رہنے کی کوئی خواہش نہیں رہی۔ دو تین شعر تم بھی سنو

کسی کی خاک میں ملتی جوانی دیکھتے جاؤ
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

حسرت برس رہی ہے ہمارے مزار پر
کہتے ہیں سب یہ قبر کسی نوجواں کی ہے

سنگ پھینکے ہیں میری قبر پہ گل کے بدلے
گالیاں دے ہے پس مرگ بھی قل کے بدلے

پڑھی نماز جنازہ ہماری غیروں نے
مرے تھے جن کے لیے وہ رہے وضو کرتے

میں جانتا ہوں تمہیں میرا خط اچھا نہیں لگے گا کیونکہ تمہیں زندگی عزیز ہے۔ مگر میرے عزیز ہم سب کو ایک روز مرنا ہے۔ لہٰذا اس زندگی کا ایک ایک لمحہ موت کو یاد کرتے ہوئے گزارنا چاہیے۔

تمہارا دوست! غمگین سلیمانی

## خوش باش عیش پوری کا خط

ہیلو عطا!

یار آج اخبار میں پڑھا کہ کشمیری حریت پسند مقبول بٹ کو بھارتی حکومت نے پھانسی دے دی ہے۔ بھئی اس پر ایک لطیفہ یاد آیا ہے۔ پرانے زمانے میں تین افراد کو سزائے موت کا حکم ہوا' چنانچہ ان میں سے ایک کو معمول کے مطابق گلوٹین کے نیچے لٹا دیا گیا اور اس کی آخری خواہش پوچھی گئی اس نے اپنی آخری خواہش بتائی' اس کے بعد گلوٹین کا بٹن آن کر دیا گیا۔ مگر جب تیز دھار والا یہ آلہ اس شخص کی گردن کے قریب پہنچا تو مشین میں کسی خرابی کی وجہ سے وہ وہیں رک گیا' چنانچہ قواعد کے مطابق اس کی جان بخشی ہو گئی' پھر دوسرے شخص کے ساتھ بھی ایسے ہی ہوا۔ یعنی گلوٹین کسی فنی خرابی کی وجہ سے اس کی گردن کے قریب آ کر رک گئی اور یوں اس کی جان بھی بچ گئی۔ اس کے بعد جلادوں نے تیسرے شخص کو گلوٹین کے نیچے لٹایا اور پوچھا ''تمہاری آخری خواہش کیا ہے'' اس نے کہا ''تم میری آخری خواہش پر لعنت بھیجو پہلے اپنی مشین ٹھیک کراؤ'' میں جانتا ہوں تم نہیں ہنسو گے' تمہیں مقبول بٹ کی پھانسی کا صدمہ ہوگا' چھوڑو یار' کن چکروں میں پڑے ہوئے ہو' جس بدقسمت شخص نے اپنے لیے زندگی کی بجائے موت کو پسند کیا۔ وہ بھی کوئی شخص ہے کہ اس کے لیے خواہ مخواہ اداس ہوا جائے۔ زندگی سب سے بڑی حقیقت ہے' زندہ رہنا اور ہر قیمت پر زندہ رہنا اصل زندہ دلی ہے'' شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے'' جیسی باتیں زندگی کی نعمتوں سے محروم یا مایوس لوگوں کی گھڑی ہوئی ہیں۔ میں تو کبھی کسی جنازے میں شریک نہیں ہوتا' جنازے کو کندھا دیتے ہوئے اور روتے ہوئے لوگ کس قدر مضحکہ خیز لگتے ہیں کل میرا ہمسایہ مر گیا۔ میں اس وقت گلی میں سے گزر رہا تھا جب اس کا جنازہ گھر سے برآمد ہوا' چنانچہ مجبوراً مجھے چند قدم جنازے کے ساتھ جانا پڑا' مگر یار کندھا دیتے ہوئے چارپائی جس طرح کبھی ایک طرف کو اور کبھی دوسری طرف لڑھک جاتی تھی' اس پر مجھے اپنی ہنسی پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔ چنانچہ میں دوڑ کر واپس اپنے گھر میں گھس گیا اور اپنے کمرے کی چٹخنی چڑھا کر دیر تک ہنستا رہا۔ اب تم پھر اس پر منہ بسورو گے اور کہو گے کہ انسان کو نہ غمگین سلیمانی ہونا چاہیے کہ ہر وقت موت کو یاد کرتا رہے اور نہ اتنا سنگدل ہونا چاہیے کہ اسے کبھی موت یاد ہی نہ رہے تم دراصل منافق آدمی ہو۔ چنانچہ ہر معاملے میں اعتدال کا راستہ تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہو۔ ارے میاں اس چکر سے نکلو ورنہ جینا بھی مشکل ہو جائے گا اور مرنا بھی مشکل ہو جائے گا۔ لاحول ولاقوۃ یہ کیا موت کا ذکر درمیان میں لے آیا ہوں۔ ایک تازہ لطیفہ سنو' ابھی کل ہی سنا ہے ریلوے کی ملازمت کے لیے ایک شخص کا انٹرویو ہو رہا تھا۔ انٹرویو لینے والے نے پوچھا ''اگر تم دیکھو کہ دو گاڑیاں ایک ہی پٹڑی پر آمنے سامنے آ رہی ہیں تو تم کیا کرو گے''۔ ملازمت کے خواہشمند نے کہا ''میں کانٹا بدل دوں گا''۔

''اگر اس وقت کانٹا بدلنا ممکن نہ ہوا' تو پھر کیا کرو گے؟''

''پھر میں سرخ جھنڈی لہراؤں گا''۔

''اگر اس وقت سرخ جھنڈی دستیاب نہ ہوئی تو پھر؟''

''پھر میں لالٹین ہاتھوں میں پکڑ کر خطرے کا اشارہ دوں گا''

''اگر اس وقت تمہیں لالٹین بھی نہ ملی تو پھر کیا کرو گے''

''تو پھر میں اپنے چھوٹے بچے کو گھر سے لے آؤں گا''۔

''وہ بچہ وہاں کیا کرے گا؟ انٹرویو لینے والے نے پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں۔ اسے گاڑیوں کی ٹکر دیکھنے کا بہت شوق ہے'' انٹرویو دینے والے نے جواب دیا۔

دراصل یہ جواب جو اس نے سب سے آخر میں دیا ہے' اسے سب سے پہلے دینا چاہیے تھا' کیونکہ اس قسم کے مناظر واقعی بہت ''تھرلنگ'' ہوتے ہیں تم جو سپر پاورز کے تصادم دیکھ دیکھ کر کڑھتے رہتے ہو تو پیارے ان پر کڑھنا نہیں چاہیے انہیں انجوائے کرنا چاہیے۔ میں نے اور تم نے کون سا کوئی روز روز پیدا ہونا ہے کہ خواہ مخواہ سارے جہاں کے درد کو اپنے جگر میں جگہ دیتے پھریں۔ ہمیں تو

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

والی نصیحت پر عمل کرنا چاہیے۔ تمہارا دوست غمگین سلیمانی اسے نصیحت نہیں' وصیت کہے گا' چلو وصیت ہی سہی' مگر سبحان اللہ کیا عمدہ وصیت ہے کتنا اچھا ہو اگر کسی کو مجبوراً مرنا پڑ جائے تو وہ اس قسم کی وصیت کر کے مرے۔ سقوط حیدرآباد' سقوط جونا گڑھ' سقوط کشمیر اور سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے مجھے چند لاجواب لطیفے یاد آ رہے ہیں' مگر اس وقت مجھے ایک پارٹی میں شرکت کے لیے جانا ہے' لہٰذا پھر کبھی سناؤں گا۔

تمہارا دوست! خوش باش عیش پوری

# پُرامن "مزاح راہ"

گل نوخیز اختر

ایک جگہ چند بزرگ بیٹھے تھے، اتنے میں ایک نئے بزرگ وہاں تشریف لائے اور سلام دعا کے بعد بیٹھ گئے۔ کسی نے احتراماً پوچھا کہ "حضور آپ کس کے مرید ہیں؟" نئے آنے والے بزرگ بولے "میں اپنے پیر و مرشد کا نام بغیر وضو کے نہیں لے سکتا۔" اس کے بعد وہ اُٹھے، وضو کیا اور زار و قطار رونے لگے۔ اتنا روئے اتنا روئے کہ دامن گیلا ہو گیا۔ پھر انتہائی عقیدت و احترام سے بولے "میں اپنی بیوی کا مرید ہوں" یہ سنتے ہی سارے بزرگ بے اختیار یک زبان ہو کر بولے "ماشاء اللہ! آپ تو ہمارے ہی پیر بھائی نکلے۔"

علی رضا احمد بھی مزاح نگاری کے "فرقہ قاسمیہ" سے تعلق کی بنا پر ہمارے پیر بھائی ہیں۔ استاد محترم عطاء الحق قاسمی صاحب کے شاگردوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ مجھے یقین ہے عنقریب ان کے اتنے شاگرد ہو جائیں گے کہ استاد محترم چاہیں تو احتجاجاً ایک دن کے مختصر نوٹس پر کسی بھی شہر کی مزاح نگاری وغیرہ بند کروا سکتے ہیں۔ علی رضا کا تعلق ساہیوال سے ہے۔ حالانکہ ان کے قریبی دوست اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کا تعلق کس سے ہے۔ میں اس سے قبل ان کی دو کتابیں "وجھی آں" اور "ایرے غیرے" سے بھی لطف اندوز ہو چکا ہوں۔ "مزاح راہ" ان کی تیسری کتاب ہے۔ نئی کتاب لانے سے پہلے پرانی سے اجازت لینا بہت ضروری ہے۔ ورنہ تخلیقی زندگی عذاب بن جاتی ہے۔ علی رضا کے انداز تحریر سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تیسری کتاب، پہلی دونوں کتابوں سے بھرپور مشورے اور اجازت کے بعد لائے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تینوں کتابوں کے حقوق پورے کرتے نظر آتے ہیں۔

ایک معروف کالم نگار بڑے فخر سے بتاتے ہیں کہ انہوں نے اپنے آدھے سے زیادہ کالم باتھ روم میں بیٹھ کر تحریر کیے ہیں۔ ان کی تحریر سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے لیکن علی رضا کے متعلق میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے اپنے بیشتر مضامین گرمیوں کی چھٹیوں میں لکھے ہیں۔ کیونکہ ایسی شگفتگی اسی وقت نصیب ہوتی ہے جب بچے اپنی والدہ کے ہمراہ "نانو" کے گھر گئے ہوں۔ ہمارے ایک دوست کو ان کی اہلیہ نے کہا کہ میں کچھ دن کے لیے اپنی ماں کے گھر جانا چاہتی ہوں۔ پوچھا "کتنے دنوں کے لیے؟" کہنے لگیں "پندرہ دن کے لیے" دوست نے کچھ سوچا اور کہنے لگا "دیکھئے! اگر آپ پندرہ دن کے لیے جانا چاہتی ہیں تو براہ کرم یہ مدت پندرہ دن ہی ہونی چاہیے، ایسا نہ ہو کہ آپ چودھویں دن واپس تشریف لے آئیں۔" علی رضا کی کتاب "مزاح راہ" سے طبیعت خوش کر دینے والے کچھ جملے ملاحظہ کیجیے۔

☆ فلم بنانا کوئی کھیل نہیں، اگر یہ کھیل ہوتا تو فلمیں صرف سیالکوٹ میں بنا کرتیں۔

☆ جسمانی گفتگو سے بھی پرہیز ضروری ہے کیونکہ بعض اوقات جسم وہ بیان کرتا ہے جو زبان بیان نہیں کر سکتی۔

☆ کالا باغ ڈیم نہ بننے کا سب سے زیادہ نقصان گجروں کو ہو رہا ہے۔

☆ اگر کوئی آپ کو پورا سمندر ہی دے دے تو بھی اس سے مچھلی کا تقاضا نہ کریں۔

☆ پنجاب میں اگر کوئی شخص اپنی ایک ٹانگ اور بازو سے محروم ہو کر ہسپتال پہنچ جائے تو عیادت کرنے والے پھر بھی یہی پوچھتے ہیں "ہور کی حال اے"۔

☆ ناکام لیڈر کباڑیے کی طرح ہوتا ہے۔ اس کے پاس کئی کاروں کا انبار ہوتا ہے لیکن وہ ان سے ایک کار نہیں بنا سکتا۔

☆ کامیاب خاوند وہ ہوتا ہے جو اپنی بیوی کے خرچے سے بڑھ کر کمانے کی کوشش کرے اور کامیاب بیوی وہ ہوتی ہے جو ایسا محنتی خاوند تلاش کر لے۔

☆ ہمارے کئی سیاستدان عمر کے اس حصے میں پہنچ چکے ہیں کہ اب تو کمزوری کے باعث ہاتھوں سے وکٹری کا نشان بھی نہیں بنا سکتے۔

علی رضا لفظی توڑ پھوڑ سے مزاح تخلیق

کرنے میں ماہر ہیں۔ ان کا جملہ طوالت اختیار نہیں کرتا۔ انہیں احساس ہے کہ جملے کی غلیل کو کتنا کھینچنے سے مطلوبہ ہدف حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس کتاب میں علی رضا نے اپنے بعض مضامین میں اپنی ذاتی مزاحیہ شاعری کا تڑکا بھی لگایا ہے جنہیں پڑھ کر مجھے کامل اطمینان نصیب ہوا کہ شکر ہے میرا مزاح نگار دوست ہمیشہ ایک شگفتہ نثر نگار ہی رہے گا۔ مزاح نگاروں کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ شاعروں کی طرح ایک دوسرے کے مخالف نہیں ہوتے، ساری ساری رات مشاعروں کی طرح ''مزاحرے'' نہیں کرتے، خوش لباس ہوتے ہیں اور اپنی تحریر کی طرح تروتازہ نظر آنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اصناف نثر میں مزاح کو ''صنف نازک'' کی حیثیت حاصل ہے۔ لہٰذا اس کا خیال بھی صنف نازک کی طرح ہی رکھنا پڑتا ہے یعنی بلاوجہ کی طبع آزمائی سے مکمل اجتناب۔ علی رضا کی اس ہنستی مسکراتی کتاب کا انتساب بڑا عجیب ہے۔ لکھا ہے ''ان خوبصورت جوڑوں کے نام جن کا درد سے رشتہ قائم ہے''۔ غالباً یہ دنیا کی واحد کتاب ہے جس کا انتساب ''جوڑوں کے درد'' کے نام کیا گیا ہے۔ اسی سے مصنف کے حالات اور آلات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مزاح نگاری میں ہنستے ہنستے آنکھیں نم ہو جانے کا سامان نہ ہو تو وہ محض یکطرفہ ٹریفک بن کر رہ جاتی ہے۔ علی رضا کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ طنز و مزاح میں ''طنز اور مزاح'' کے تناسب سے بخوبی آگاہ ہیں۔ طنز کسی بھی جملے کی جان بھی ہوتا ہے اور جان نکال بھی لیتا ہے لیکن جب طنز کا نشتر حقیقت کے کرب میں مبتلا کر دے تو ہاتھ سیدھا کلیجے پر پڑتا ہے۔ علی رضا لکھتے ہیں ''محتاج کی ایک کمزوری یہ ہوتی ہے کہ وہ فریاد کر سکتا ہے، فرمائش نہیں'' اسی طرح ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ''بعض لوگ گیدڑ سنگھی کے بل بوتے پر شیر بننا چاہتے ہیں!!!''

علی رضا مزاح نگاری میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں لیکن چونکہ درویش طبع ہیں اس لیے انہیں خود بھی اپنے مقام کا اندازہ نہیں۔ بالکل ہمارے ایک شاعر کی طرح جو کہتے ہیں کہ میں بہت بڑا شاعر ہوں لیکن کسی کو بتاتا نہیں۔ انہی شاعر صاحب نے ایک دفعہ اپنا مجموعہ کلام مجھے عنایت فرمایا اور بولے ''یہ کتاب میں نے اتنی محنت اور عرق ریزی سے لکھی ہے کہ کئی دفعہ پاگل ہوتے ہوتے بچا ہوں'' میں نے کہا ''یہ آپ کا وہم ہے'' علی رضا کی ''مزاح راہ'' فکاہیہ ادب میں ایک خوشگوار اضافہ ہے۔ ورنہ کئی مزاح کے نام پر کئی ایسی کتابیں بھی پڑھنے کو مل رہی ہیں جنہیں ایک دفعہ پڑھ لیا جائے تو ہنس ہنس کر برا حال ہو جاتا ہے۔ مجھے اُمید ہے اس تیسری کتاب کے بعد علی رضا کی تخلیقی صلاحیتیں کم ہونے کی بجائے اور بڑھیں گی اور بہت جلد وہ ہمیں چوتھی کی خوشخبری بھی سنائیں گے۔ کیونکہ مزاح کی کسی بھی کتاب کا شائع ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ خدا ابھی مزاح نگاروں سے مایوس نہیں ہوا۔ (الحمراء آرٹس کونسل لاہور میں منعقدہ تقریب میں پڑھا گیا)


شور مسلسل رہتا ہے
مجھ میں دریا بہتا ہے
..................
کویت میں مقیم ممتاز شاعر
خالد سجاد کا پہلا شعری مجموعہ
مجھ میں دریا بہتا ہے
نہایت دیدہ زیب انداز میں شائع ہوگیا ہے
صفحات 160 قیمت 300 روپے
ناشر
نستعلیق مطبوعات
الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور
0300-4489310 / 0423-7351963

نامور شاعر اور سنگر
عدیل برکی کا پہلا شعری مجموعہ
گستاخ نگاہی کا گلہ
نہایت دیدہ زیب گیٹ اپ کے ساتھ
شائع ہوگیا ہے
صفحات 208 قیمت 400 روپے
ناشر
نستعلیق مطبوعات
الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور
0300-4489310 / 0423-7351963

# چھیتی بوڑیں وے طبیبا

ابرار ندیم

صدر جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کے عروج کا دور تھا۔ سرکار ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے عمل پیرا تھی۔ "حکم" تھا کہ ظہر کے اوقات میں تمام سرکاری ملازمین دفاتر میں باجماعت نماز کا اہتمام کریں۔ انہی دنوں کی بات ہے سرکاری آرڈر سے متاثر ایک "نیم ملا" مسجد میں لاؤڈ سپیکر پر جمعے کا خطبہ دیتے ہوئے یوں واعظ کر رہا تھا۔

"لوگو نماز پڑھو کیونکہ یہ اللہ کے رسول کا حکم ہے، لوگو نماز پڑھو کیونکہ یہ اللہ کا حکم ہے، لوگو نماز پڑھو کیونکہ اور تو اور یہ صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق کا حکم ہے"

کل یکم فروری اردو کے صاحب طرز ادیب، مزاح نگار، کالم نویس، شاعر، ڈرامہ نگار اور اُستادوں کے اُستاد محترم عطاء الحق قاسمی کی سالگرہ کا دن تھا۔ جس کی خوشی میں آج ہم سب یہاں جمع ہیں۔ آپ کہیں گے اُستاد یہ اُستادوں کے اُستاد والی بات کیا ہوئی تو عرض کروں گا کہ اور بے شمار شاگردوں کی طرح آپ میرے بھی اُستاد ہیں جبکہ میرے دوستوں کا میرے بارے میں یہ خیال ہے کہ میں بڑا اُستاد ہوں۔ تو پھر اس طرح قاسمی صاحب ہوئے نہ اُستادوں کے اُستاد۔ اب آپ پوچھیں گے خوشی کے اس موقع پر اس فضول تمہید کی کیا تُک بنتی ہے؟ تو میں کہوں گا کہ میری طرف سے اس کے دو جواب ہو سکتے ہیں۔ پہلا جواب تو یہ ہے کہ "اینویں!!" جبکہ دوسرا اور اصل جواب دراصل آپ کو یہ باور کرانا تھا کہ آج قاسمی صاحب کی سالگرہ کے حوالے سے منعقدہ تقریب کے موقع پر اُن کی نصف صدی سے زائد عرصہ پر محیط علمی و ادبی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے اور اپنی محبتوں کے پھول نچھاور کرنے کے لئے اُن سے پیار کرنے والے بے شمار نامور ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور دانشوروں کے ساتھ اور تو اور میں بھی یہاں موجود ہوں۔

آپ خود سوچیں 1970ء میں جب عطاء الحق قاسمی امریکہ بہادر کو "تین طلاقیں" دے کر ہمیشہ کے لئے ہمارے پیارے وطن پاکستان واپس آ رہے تھے تو کیا انہیں معلوم تھا کہ اسی برس فروری کی 14 تاریخ کو پاکستان کے دور دراز مضافات میں ایک ایسا بچہ جنم لے گا جو آگے چل کر آج کے دن یعنی دو فروری 2015ء کو ملک کے بڑے بڑے اور نامور دانشوروں، ادیبوں اور صحافیوں کی موجودگی میں اُن کی علمی، ادبی اور شخصی عظمتوں کو خراج تحسین پیش کرے گا۔

"بے شک اللہ جسے چاہتا ہے اُسے عزت دیتا ہے"

اب آپ پوچھیں گے کہ یہ "میں کون ہوں؟" اس کا ایک سیدھا سادا اور جان چھڑوانے والا جواب یہ ہے کہ "کیہ جاناں میں کون او وے بُلھیا؟" جبکہ دوسرا اور اصل جواب یہ کہ ہال میں موجود وہ خواتین و حضرات جن کی کتابوں بالخصوص "فیس بک" میں دلچسپی نہیں ہے وہ مجھے واقعی نہیں جانتے ہوں گے۔ اُن کے تعارف کے لئے بتا دیتا ہوں کہ ناچیز کو ابرار ندیم کہتے ہیں مگر واضح رہے کہ یہ ناچیز کسی بھی طرح میرے نام اور شخصیت کا حصہ نہیں ہے۔ یہ وضاحت اس لئے بھی ضروری ہے کہ مبادا آپ مجھے حقیقت میں "ناچیز" سمجھنا اور پکارنا شروع کر دیں۔ جیسا کہ یار لوگ اکثر شروع شروع میں پیار پیار سے الٹے سیدھے ناموں سے پکارتے ہیں اور بعد میں سچ مچ بھی اُسی نام سے پکارنے لگ جاتے ہیں جو مزید بعد میں اللہ معاف کرے بندے کی "چھیڑ" بن جاتی ہے۔

خیر مزید وقت ضائع کیے بغیر میں آپ کو اپنے بارے میں بتا دوں۔ اگر آپ نے فیس بک پر میری شاعری نہیں پڑھی اور ریڈیو پر بطور کمپیئر میرا کوئی پروگرام نہیں سُنا تو بغیر کسی ہچکچاہٹ کے آپ مجھے بھی ملک کے نامور شاعروں، صحافیوں، ادیبوں اور براڈ کاسٹرز میں شمار کر سکتے ہیں۔ بصورتِ دیگر یہاں شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں کے ساتھ چند معززین شہر بھی موجود ہیں آپ مجھے کسی کڑوے گھونٹ کی طرح چارو ناچار ہی سہی اُن کے کونے میں بھی فٹ کر سکتے ہیں۔ یوں بھی فی زمانہ معزز بننے کے لئے کسی خاص "کوالیفیکیشن" کی کہاں ضرورت پڑتی ہے۔

یکم فروری 2015ء محترم عطاء الحق قاسمی کی سالگرہ کا دن ہے اور جیسا کہ میں آپ کو شروع میں بھی بتا چکا ہوں کہ اسی مہینے میں ٹھیک بارہ دن بعد 14 فروری میری پیدائش کا دن ہے بلکہ مبارک دن ہے۔ اب جسے لوگ پاکستان سے باہر بھی دُنیا بھر میں ویلنٹائن

ڈے یعنی محبت کے یادگار دن کے طور پر مناتے ہیں اور ایک دوسرے کو محبت کے اظہار کیلئے گلاب کے سرخ پھول تحفے میں پیش کرتے ہیں۔لیکن جیسا کہ آپ نے بھی سنا ہوگا ، چراغ تلے ہمیشہ اندھیرا ہوتا ہے۔وائے قسمت! اپنی سالگرہ کے دن ہمیں تو آج تک بھی کسی نے گلاب کا پھول تو ایک طرف گوبھی یا تمباکو کا پھول بھی نہیں دیا۔یقیناً ایسے ہی کسی موقع کے لئے لاریوں،بسوں اور رکشوں کے پیچھے یہ لکھا ہوا ہے۔

"پسند اپنی اپنی،نصیب اپنا اپنا"

لیکن وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے ناں۔

ادھر نہیں جوڑ جائے حالات کے خونی منظر سے
جس حال میں جینا مشکل ہو اس حال میں جینا لازم ہے"

سو ان حالات میں ہمیشہ محترم عطاء الحق قاسمی کے دورِ طالبعلمی کے ایک شعر کو بطور پالیسی مضبوطی سے پلے باندھے رکھا ہے۔جس میں آپ نے کہا تھا

"بنتے ہیں تیرے چار سو فی الحال چار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ"

خدارا اس سے ہرگز یہ نہ سوچیے گا کہ قاسمی صاحب نے بھی اپنے وقت میں یہ شعر کہیں میرے جیسے " ناروا۔کڑے اور نامسائد" حالات میں کہا ہوگا۔اگر آپ ایسا سوچ یا سمجھ رہے ہیں تو کوئی بھی حتمی رائے قائم کرنے سے پہلے فیس بک پر قاسمی صاحب کی نوجوانی کی وہ تصویر ایک بار ضرور دیکھ لیں جسے دیکھ کر بے اختیار آپ بھی کہہ اٹھیں گے۔

"نازو انداز و ادا ہونٹوں پہ ہلکا سا تبسم
تیری تصویر میں سب کچھ ہے تکلم ہی نہیں"

سادہ لفظوں آپ یہ سمجھ لیں یہ ایک ایسی تصویر ہے جس کے بارے میں ایک گانے کے مکھڑے میں یوں کہا گیا ہے۔

"ماہی ماہی میتوں چھلا پوا دے
کچھ میری فوٹو تے ہوئے پے لا دے"

قاسمی صاحب کی وہ تصویر دیکھ کر آپ کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جائے گا کہ آپ کی تحریر زیادہ قاتل ہے یا آنکھیں۔قاسمی صاحب کی تحریروں کا تو ایک عالم معترف ہے،رہی بات آپ کی آنکھوں کی تو اس حوالے سے محض اتنا کہوں گا کہ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا،جس جس کو میرے دعوے کی تصدیق مطلوب ہے وہ یہاں سٹیج پر قاسمی صاحب کے قریب بلکہ " عنقریب" آ کر ایک دفعہ آپ کی آنکھوں میں ضرور جھانکے۔اگر آپ کے کانوں اور دل میں نصیبو لال کا گانا

"بڑیاں عاشق مزاج اکھاں تیریاں وے بدو بدو
لڑی جاندیاں"

بجنا شروع نہ ہو جائے تو پیسے واپس،لیکن اس کے ساتھ یہ وضاحت بھی کردوں کہ یہ دعوت صرف خواتین کے لئے ہے اور وہ بھی اُن کی اپنی ذمہ داری پر،کسی حادثے یا نقصان کی صورت میں کمپنی ہرگز ذمہ دار نہ ہوگی۔یہ نقصان کا میں نے اس لئے کہا ہے کہ ایکسیڈنٹ دل کا ہو یا گاڑی کا نقصان کا احتمال تو بہرحال رہتا ہی ہے۔

خواتین وحضرات! بات قاسمی صاحب کی "ہمب" فوٹو سے چلی تھی تو میرے خیال میں موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ بتانے میں کوئی ہرج نہیں کہ خیر سے فوٹو اپنی بھی اکثر اوقات بڑی "پوپٹ" آتی ہے لیکن صد افسوس کہ اپنا "پوپٹ پن" صرف تصویروں تک ہی محدود ہے جبکہ بچشمِ بدور قاسمی صاحب آج اپنی بہترویں سالگرہ پر بالمشافہ بھی مطلق پوپٹ "اور لش پش ہیں۔جس کا ایک راز تو یقیناً ان کی اپنی زندہ دلی اور خوش مزاجی ہے،مگر مجھ ناہنجار کو پتا نہیں کیوں یہ یقین ہے کہ آپ کی اس سدا بہار جوانی،خوبصورتی اور بالخصوص ہر دلعزیزی کے پیچھے کوئی گہرا راز اور بھی ہے جسے آپ نے ابھی تک میرے جیسے ندیدے شاگردوں سے چھپا کر رکھا ہوا۔یہ جو آج ایک ہجومِ عاشقاں آپ کی سالگرہ کے حوالے سے منعقدہ تقریب میں آپ سے اپنی محبت اور عقیدت کے اظہار کے لئے یہاں جمع ہے تو اس کا کوئی سبب تو ضرور ہے بقول ابن انشا

"اس شہر میں کس سے ملیں،ہم سے تو چھوٹیں محفلیں
ہر شخص تیرا نام لے، ہر شخص دیوانہ ترا
کوچے کو ترے چھوڑ کر جوگی ہی بن جائیں مگر
جنگل ترے،پربت ترے،بستی تری صحرا ترا"

آخر میں آپ سب کی موجودگی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے اُستادِ محترم عطاء الحق قاسمی صاحب سے مودبانہ و عاجزانہ گزارش کروں گا کہ آج بڑی خوشی کا موقع ہے دوسرے لفظوں میں رسمِ دُنیا بھی ہے موقع بھی دستور بھی ہے۔اپنے چاند سے مکھڑے اور ہر دلعزیزی کا صدقہ اُتاریئے اور خدارا مجھے بھی وہ وظیفہ یا گیدڑ سنگی عطاء کریں جس کے بعد دنوں میں نہیں منٹوں میں محبوب میرے قدموں میں بھی ہو۔اس لئے کہ برسوں سے محبوب کے قدموں میں "پیراں پرنے" بیٹھ بیٹھ کراب میں عاجز آ گیا ہوں اور میری ہمت بھی جواب دیتی جارہی ہے۔

"چھیتی بوڑیں وے طبیبا نئیں تے میں مر گئیاں"

(محبانِ عطاء الحق قاسمی کے زیر اہتمام الحمرا لاہور میں منعقدہ تقریب کے لئے لکھا گیا)

# عظیم کرکٹر

احمد سعید/پڑنگال

آٹھویں میں سیکنڈ پوزیشن آئی تو بڑی شرمندگی ہوئی کہ دس نمبروں سے پہلی پوزیشن رہ گئی۔ میٹرک میں اٹھائیسویں پوزیشن آئی تو بہت خوشی ہوئی کہ تقریباً دس نمبروں سے فیل ہونے سے رہ گیا۔

دونوں جماعتوں کے حوالے سے میں خاصہ معاملہ فہم ثابت ہوا تھا۔ اس لئے میٹرک میں ہر ایک کے معاملات میں ٹانگ اڑانا شروع کر دی۔ بس کمیٹیوں والی مائی نہیں بن سکا۔ لگائی بجھائی میں ماہر جو نہ تھا۔ جیسے کہ

وہ آئے دکھائی مزہ تو ہے دیتی
''بیٹا'' ہو پرائی مزہ تو ہے دیتی
ہزاروں نقائص ہیں اس میں پر احمد
لگائی بجھائی مزہ تو ہے دیتی

آٹھویں میں سب نے مبارکباد دی تو میں نے پوری پوری ہی وصول کی۔ میٹرک میں بھی میں نے مبارکباد وصول کی لیکن پوری گرم جوشی سے کہ شکر ہے بال بال بچ گئے۔ ''ہیڈ اینڈ شولڈر'' جو استعمال کرتا تھا۔

نویں جماعت کے سالانہ امتحانات کے بعد اگر کسی نے آٹھویں جماعت کے نمبر پوچھتے تو میری طرف غصے سے دیکھتا کہ یہ ہمارے ساتھ مذاق کر رہا ہے۔ کئی اُساتذہ کو آٹھویں کا سرٹیفکیٹ دکھانا پھر کہیں جا کر اُن کا غصہ ٹھنڈا پڑتا وہ بھی چند لمحوں کیلئے اور پھر غصہ چڑھ جاتا کہ اگر آٹھویں میں اتنے نمبر لئے تھے تو اب اُس سے آدھے ہی لے لیتے۔ میں نے کہا کہ انضمام الحق پر بھی bad patch آیا، یہاں تک کہ عمران خان پہ آیا اور کس کس کھلاڑی پہ نہیں آیا؟

انہوں نے کہا: ''اچھے کھلاڑی ہو بھئی جو بات کو کہاں سے کہاں لے گئے ہو''۔

کھلاڑیوں سے یاد آیا کہ میں نویں جماعت میں تھا کہ اقبال سٹیڈیم میں انڈر16 کے ٹرائل شروع ہوئے۔ میں اپنے آپ کو پہلے ہی ایک عالمی کھلاڑی تصور کرتا تھا۔ سو چل دیئے۔ ہارڈ بال بھی کھیلی نہ تھی۔ اِس لئے لباس بھی نہ تھا۔ فوری طور پر کرکٹ کا لباس، بیٹ، پیڈ، ہیلمٹ اور انتہائی اہم ''گارڈ'' خریدنے کیلئے نکل پڑا۔ پھر سوچا کہ اگر سلیکٹ نہ ہوا تو بعد میں کھیلنا تو ٹینس بال سے ہی ہے۔ اس لئے لباس کے بغیر ہی سٹیڈیم چل پڑا۔ کرکٹ کے لباس کی بات کر رہا ہوں ویسے تو مختلف رنگوں کا ٹروزر، ٹی شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ بڑے بہنوئی مجھے سٹیڈیم چھوڑنے آئے۔ اندر داخل ہوا اور بیٹنگ کی لائن میں لگ گیا۔ نہ ہاتھ میں بیٹ، نہ ٹانگوں پہ پیڈ، نہ سر پر ہیلمٹ۔ بس چالان ہونے ہی والا تھا۔ اِدھر اُدھر کوئی جاننے والا دیکھا۔ پر کوئی نہ ملا تو کسی نہ کسی سے کسی نہ کسی طرح دوستی نکالنا شروع کر دی۔ بھئی لوگ رشتہ داریاں نکال لیتے ہیں کیا میں دوستی نہیں نکال سکتا تھا؟ اتنی جلدی میں جتنی دوستی ہو سکتی تھی اُس سے صرف پیڈ اور ہاتھوں کے دستانے ہی ہاتھ آئے اور لگا رہا لائن میں۔

اب باری بہت قریب آ چکی تھی۔ بلا کسی صورت کوئی دینے کو تیار نہ تھا۔ باری سر پر تھی، مشکل بھی سر پر ہی۔ جب میرے آگے ایک بلے باز رہ گیا تو میں کبوتر باز بن گیا۔ جیسے کبوتر باز کبوتر پکڑنے کیلئے کبوتر کو ایک سیکنڈ کی مہلت نہیں دیتا۔ اس طرح میں نے جب بلے باز اپنی باری لیکر ابھی سرزمین کرکٹ یعنی گراؤنڈ سے باہر نہیں آیا تھا کہ اُس پر ایسے جھپٹا جیسے بلی چھچھوندروں پر۔ میرے پہلے ہی وار پہ وہ بوکھلا گیا دوسرا وار میں نے کیا نہیں بلکہ اُسے سمجھایا کہ یہ وار نہیں پیار ہے۔ آپ اس قدر اچھا کھیلتے ہیں کہ آپ کی صلاحیتوں کے ساتھ اس بلے میں بھی صلاحیتیں داخل ہوگئیں۔ جناب مَن! میں باری لیکر ابھی آیا۔ یہ دیکھیں بس میری باری بھی آئی کھڑی۔ اور اُس سے بلا مانگا کہاں بلکہ چھین لیا اور شکریہ ادا کیا۔ اسے مسلسل داد دیتا گیا کہ واہ کیا کھیل کر آئے ہیں۔ اب وہ بھی جانتا تھا کہ وہ کیا کھیل کر آیا ہے۔ کیونکہ اُس سے کوئی ایک گیند بھی کھیل نہ ہوئی تھی۔ بھئی یہ بھی تو کمال ہی تھا کہ بیس پچیس گیندیں کھیلیں اور کسی گیند کو بلے کے نیچے نہیں لگنے دیا۔ یہاں تو پورا بندہ ہی اپنی زوجہ کے تھلے (نیچے) لگ جاتا ہے۔

اتنے میں اس نے اپنا ساز و سامان اُتارا تو میں پھر دوڑا دوڑا اُس کے پاس گیا۔ داد دی اور ساتھ میں اُس کا گارڈ بھی اُٹھا لایا اور ہاتھ کے اشارے سے

اُسے کہنے لگا کہ یار یہ بہت ضروری تھا بیٹ سے بھی زیادہ۔ میں ہیلمٹ پہنے ہوئے نہ تھا اور سامنے باؤلر بھی شعیب اختر نما تھا۔ لمبے لمبے ہاتھ لمبے لمبے پاؤں، اب میں نے دو چیزیں بچانی تھیں ایک منہ اور ایک وکٹ۔ کوئی تین اوورز کے بعد سپن باؤلر جسے گوگلی بھی کہتے ہیں گیند کروانے کیلئے آیا اور مجھے سُکھ کا سانس آیا۔ پھر میں نے اِدھر اُدھر بلا گھمانا شروع کر دیا۔ میری فٹنگ نہیں ہوئی تھی۔ بلا گھمانے سے مراد شارٹس لگا رہا تھا۔ سلیکٹر سمجھ گیا کہ یہ شارٹ کٹ کھیل رہا ہے۔ وہ بھی اپنی طرف سے بڑے وقار یونس تھے۔ انہوں نے ایک بار پھر تیز باؤلنگ لگائی پر میں نے دوڑ نہ لگائی۔ ڈٹا رہا منہ اور وکٹ بچانے کیلئے۔ پھر ایک دم خیال آیا کہ عزت بھی بچانی ہے صرف منہ اور وکٹ ہی نہیں۔ اسی اثناء میں نظریں نیچے گئیں باؤلر سر پہ تھا نظر اوپر اُٹھائی تو وکٹ جا چکی تھی۔ جانے عزت کا کہاں سے خیال آ گیا۔ جبکہ گارڈ میں نے پہنا ہوا تھا۔ میں کلین بولڈ ہو چکا تھا بلکہ صرف بولڈ کیونکہ گھر سے میں نہا کر نہیں آیا تھا تو کلین (Clean) تو نہ ہوا اور بولڈ ویسے ہی بہت تھا۔

میں بچپن بلے بازوں میں شامل نہ ہو سکا تو باؤلنگ میں قسمت آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔ سلیکٹر نے کہا، تم تو بیٹسمین ہو میں نے کہا جی نہیں میں آل راؤنڈر ہوں۔ سلیکٹر کہنے لگا، بیٹا ایک ہی چیز کا ٹیسٹ دے سکتے تھے اور ویسے بھی کرکٹر ایک چیز میں سپیشلسٹ ہوتا ہے۔ میں نے کہا، جی غلطی ہو گئی میں نے تو ٹیسٹ ہی باؤلنگ کا دینا تھا۔ وہ بڑا حیران ہوا کہ یہ کسی قسم کی غلطی ہے۔ ساتھ ہی میں نے عمران خان، وسیم اکرم، عبدالراق اور شاہد آفریدی کی مثالیں دیتے ہوئے اپنی مثال دی کہ میں بھی ان کی طرح دونوں چیزوں میں سپیشلسٹ ہوں۔ وہ گھبرایا کہ اس نے تو اپنے آپ کو پاکستانی کرکٹ ٹیم کا کھلاڑی بھی بنالیا ہے اس سے پہلے کہ یہ بغیر ٹیسٹ دیئے اُس ٹیم میں حقیقتاً شامل ہو جائے اس سے فوری باؤلنگ کا ٹیسٹ بھی لے ہی لیں۔

سلیکٹر صاحب نے مجھے بھی گیند تھمادی اور کہا کہ شروع ہو جاؤ۔ میں نے سوچا دو چار اوورز کروائیں گے پر کہاں جی، میں لگا رہا اور بس لگا ہی رہا۔ آٹھ نو اوورز لگا تار کروا کر مجھے کوئی جوس بھی نہ پلایا بلکہ نمک والا پانی پلا دیا اور پھر میں لگا رہا۔ اتنی اوورز کروا کر مجھے محسوس ہوا کہ میں جانے کب کا سلیکٹ ہو چکا ہوں۔ پر سلیکٹر نے کچھ لڑکے سلیکٹ کر کے مجھے اگلے دن پھر سلیکشن راؤنڈ کے لئے بُلا لیا۔ میں سمجھ گیا سلیکٹر کے ذہن کو کہ وہ میرے ذہن کو سمجھ گیا ہے۔ میں نے تو اُس کی جان چھوڑنی نہیں اور اُس نے میرے لئے یہ طریقہ رائج کیا ہے کہ جس دن تک سلیکشن ہونی ہے اِسے باؤلنگ ٹیسٹ کیلئے بلاتے جاؤ، کیونکہ اگر اِس کو باؤلنگ میں بھی آؤٹ کیا تو اس نے تو "جنیٹی روڈ" بن کر سامنے آ جانا ہے، یعنی کہے گا کہ آپ مجھے فیلڈنگ میں موقع دیں اور تو اور اُس کا خیال تھا کہیں میں ایمپائرنگ کا ٹیسٹ نہ اُسے دینا شروع کر دوں اور اس کے لئے بھی ایک واضح مثال علیم ڈار کی۔ اگلے دن میں بہت تھکا ہوا تھا۔ پچھلے دن سارا دن سلیکٹر نے باؤلنگ پر جو لگائے رکھا تھا۔ وہ مجھے سلیکٹ نہیں کر رہا تھا۔ ٹیسٹ میچ کھلا رہا تھا، اور مجھے عبدالرزاق یا محمد سمیع سمجھ رہا تھا کہ جتنی مرضی اوورز کروائی جاؤ نہ اس نے بولنا ہے نہ تھکنا۔ پتہ نہیں یہ دونوں باؤلر کیا چیزیں ہیں؟ تھکتے ہی نہیں۔ ہاں سگریٹ نہیں پیتے ہوں گے۔ اس طرح سے تو ایک آدھ باؤلر ایسے بھی ہیں جو پیتے ہی صرف سگریٹ ہوں گے۔ تھکے ہی رہتے ہیں۔ اُن کو سگریٹ لے بیٹھی، محمد عامر کو "نوبال" اور آصف کو تو وینا ملک ہی اور مجھے یہ سلیکٹر لے بیٹھا تھا۔ صبح امی جان نے اُٹھایا تو میں نے کہا میں نے نہیں جانا سلیکشن کیلئے، کیونکہ مجھے پتہ چل گیا تھا کہ میں سلیکٹ ہو چکا ہوں۔ صرف اس سلیکشن کے اختتام تک باؤلنگ کروانے کیلئے۔ اُدھر سے ابا جی کی گرجتی ہوئی آواز آئی کہ کیوں نہیں جانا؟ میں فوراً اُٹھ کھڑا ہوا کہ جی کس نے نہیں جانا؟ میں تو نہا کر بس نکل ہی پڑا ہوں اور پھر اپنے ایک دوست کے ہمراہ سٹیڈیم پہنچا۔

آج سلیکٹر صاحب نے ہر چیز سفید رنگ کی پہنی ہوئی تھی۔ مجھے لگا ایمپائر کی جگہ کوئی بگلا کھڑا ہے کیونکہ وہ تھے بھی کافی سمارٹ اور جتنے دن سے میں آ رہا تھا جو کچھ بھی سفید پہنیں ٹوپی کالی ہی ہوتی۔ تھوڑا سا آگے گئے تو پتہ چلا کہ وہ سلیکٹر ہی تھے آج بگلے بگلے (بدلے بدلے) محسوس ہو رہے تھے۔ گیند تھمادی مجھے اور میں پھر شروع ہو گیا سارا دن باؤلنگ کرواتا رہا۔ سارا دن بیٹنگ کرواتے تو یقین کریں میں انہیں ناشتہ بھی کرواتا تو وہ بھی یولی کے پایوں کا یا حفیظ پوری ہاؤس سے پوڑیاں۔ آج مجھ سے کچھ وائڈ بھی زیادہ جا رہے تھے جو کہ میرے حق میں جا رہے تھے۔ کیونکہ شام کو سیشن کے اختتام پر سلیکٹر صاحب نے مجھے کہا کہ بھئی آپ سلیکٹ نہیں ہوئے۔ میرا دل کیا کہ انہیں گلے لگا لوں کہ آپ کا بے حد شکریہ۔ کہیں کل پھر سارا دن باؤلنگ کیلئے نہ بلا لینا۔

افسانہ

# جُرم

انیلہ بھٹی/امریکہ

کیوں کیا تو نے ایسا جرم؟

اپنے گھر میں خود ہی آگ لگا دی۔

اب اس عمر میں یہ چھپن ہیں تیرے۔

تجھ سے اچھی تو کنجریاں ہیں۔

رنڈی کہیں کی۔

میں آئینہ کے سامنے کھڑی تھی۔ آئینہ مجھ سے بول رہا تھا۔ باتیں کر رہا تھا۔ مجھ سے سوال کر رہا تھا اور میں اس کے سوالوں کے جواب میں چپ سادھے کھڑی تھی۔ ایسے میں کوئی پتھر آئینے کو لگا اور خون میرے ماتھے سے رسنے لگا۔

آہ۔

مجھے میری ہی آہ سنائی دینے لگی۔

اتنی آگ تھی تیرے اندر؟

آگ اتنی تھی تو شوہر کو بتایا ہوتا۔

غیر مردوں سے یارانے کیوں لگائے؟

مجھے پھر سے جانی انجانی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

.................

بلوشہ جا رہا ہوں میں۔

عمر کی آواز کانوں میں پڑی تو میں کمرے سے باہر دوڑی۔ لیکن میرے جانے سے ہی پہلے وہ دفتر کے لیے جا چکے تھے۔ اب گھر تھا، میں اور میری تنہائی۔ شاید میری تنہائی ہی میرے لیے میری جاہی لا رہی تھی۔ میں ایسی بنتی جا رہی تھی جیسی میں کبھی نہیں تھی۔ میں وہ کچھ کرتی جا رہی تھی جس کا تصور میں نے عمر بھر نہیں کیا تھا۔ لیکن کچھ تھا جو مجھے اندر ہی اندر تبدیل کرتا گیا۔

''عمر آج شام ذرا جلدی آجایئے گا۔ میں عمر سے التجا کر رہی تھی۔

''کیوں تمہیں کچھ کام ہے۔'' مجھے سوجھا نہیں کہ میں کیا جواب دوں۔ میں بیوی تھی، نو بیاہتا۔ کیا کام تھا مجھے اپنے شوہر سے۔ مجھے تو بس عمر کے پاس بیٹھنا اس کے ساتھ ڈھیروں باتیں کرنا اچھا لگتا تھا۔ لیکن مجھے شادی کے بعد سے ایسا وقت نصیب ہی نہیں ہو رہا تھا۔

''نہیں کام تو کچھ بھی نہیں۔''

''نہیں آسکوں گا۔ شام کی کچھ میٹنگز ہیں۔''

وہ ٹائی لگا رہے تھے اور میں اندر ہی اندر کڑھ رہی تھی۔

''ٹھیک ہے۔'' میں تھکی تھکی سی بولی۔

''کھانا کھا کر آئیں گے۔''

''ہاں ظاہری بات ہے۔'' وہ کار کی چابیاں اٹھاتے ہوئے بولے اور کمرے سے باہر نکل گئے۔

یہ ایک وسیع و عریض ڈبل سٹوری بنگلہ تھا۔ جس میں میں بیاہ کر آئی تھی۔ بے حد کھلا، سرسبز و شاداب لان، جس میں بے حد حسین رنگوں کے گلاب کھلے رہتے تھے لیکن میں تھی کہ مرجھاتی جا رہی تھی۔ مجھے کسی بھی چیز میں دلچسپی نہیں تھی۔ بچپن سے گھر کا ماحول سخت رہا تھا۔ ابا، اماں میں خاص محبت نہیں تھی اور کوئی بڑا جھگڑا بھی نہیں تھا۔ ہم چار بہن بھائی تھے، دو بہنیں اور دو بھائی۔ میں گھر میں سب سے چھوٹی تھی، چھوٹی تھی شاید اسی لیے میری کچھ خاص اہمیت نہیں تھی۔ بہن اپنے گھر کی ہو چکی تھی۔ بھائی اپنی اپنی زندگیوں میں مگن تھے۔ مجھے یونیورسٹی جانے کا شوق تھا لیکن ابا نے بی اے کے بعد پڑھنے کی اجازت نہیں دی۔ گھر کا ماحول ایسا نہیں تھا کہ میں آزادانہ گھر سے باہر جاتی، یا مجھ سے ملنے کوئی گھر آجاتا۔ ابا اور اماں کو میرے لیے رشتے چاہئیں تھے وہ بھی کئی شرائط کے ساتھ، لڑکا پڑھا لکھا ہو، امیر ہو، جائداد کا مالک ہو، قبول صورت ہو، ہماری ہی ذات سے ہو وغیرہ وغیرہ۔ اب اتنی شرائط کے بعد رشتہ ملنا آسان بھی کہاں تھا۔ لیکن اماں ابا تھے کہ کسی صورت سمجھوتے پر تیار نہ تھے۔ حتیٰ کہ اس دوران کئی رشتے آئے تھے لیکن بات اکثر ہی ذات برادری پر آ کر رک جاتی تھی۔ بھائی حالات سے چھٹکارہ پا کر امریکہ میں جا بسے تھے اور وہیں پر اپنی اپنی پسند سے شادیاں بھی رچا بیٹھے تھے۔ ایسے میں نزلہ مجھ پر ہی گرتا تھا۔ ہوتے ہوتے میری عمر 29 سال ہوگئی۔ عمر بڑھتی جا رہی تھی لیکن ابا اور اماں ٹس سے مس نہیں ہو رہے تھے۔ گھر کی دیواریں مجھے کھانے لگی تھیں۔ میری

کوئی دوست نہیں تھی۔ سارا وقت میں کرتی ہی کیا کہ مزید تعلیم حاصل کرنا ابا کو گوارا نہیں تھا، دوست بنانے کی آزادی میرے پاس نہیں تھی۔ مجھے اپنی نجات صرف شادی میں نظر آتی تھی اور وہی ہو نہیں رہی تھی۔

میں اپنی بڑی بہن کو دیکھ کر اکثر حسد میں مبتلا ہو جاتی تھی۔ کیا مزے تھے اس کے۔ شوہر تھا، بچے تھے، سسرال کا پیار تھا۔ اس کے گھر میں جیٹھ، جیٹھانیاں، دیور اور دیورانیاں تھیں۔ سب کے بچے تھے، بھرا ہوا گھر تھا اور ایک ہمارا گھر تھا جو مجھے اکثر قبرستان جیسا لگتا تھا۔

میری ساری امیدوں کا محور بس میری شادی تھی، مجھے لگتا تھا، شادی ہوتے ہی خدا میری ساری محرومیاں دور کر دے گا میں ساری عمر شوہر کے پاؤں سے بندھی رہوں گی، اسے دیکھوں گی، اس سے باتیں کروں گے، اسے پوچھوں گی، اسے طرح طرح کے پکوان کھلاؤں گی۔ لیکن شومئی قسمت.........

عمر حیات خان کو محض اپنے آپ سے دلچسپی تھی۔ وہ تنہائی جو میں شادی سے پہلے باہر محسوس کرتی تھی اب آہستہ آہستہ اپنے اندر محسوس کرنے لگی ہوں۔ میں سمٹتے ہوئے بکھرتی جا رہی تھی۔ بنتے ہوئے ٹوٹتی جا رہی تھی۔ میرے سسرال میں بھی کوئی نہیں تھا جو میرے دکھ کو سمجھتا، مجھے دنیا کی کسی شے سے دلچسپی نہیں تھی، میں تو صرف عمر کا وقت، عمر کی دلچسپی چاہتی تھی لیکن وہی تھا جو مجھے نصیب نہیں ہو رہا تھا۔

''ایسے ہی زندگی گزارنی تھی تو پھر انہیں شادی کی کیا ضرورت تھی۔''

میں اکثر یہ سوال پوچھتے پوچھتے رک گئی کہ عمر کی خشک مزاجی یا سنجیدہ طبیعت کہہ لیجیے کہ میں عمر سے محض کام کی چند باتوں کے سوا کچھ نہ کہہ سکی اور جو میں نہ کہہ سکی وہ کبھی بھی سن نہ سکے۔

شادی کو ایک سال گزر چکا تھا میں 31 سال کی ہو چکی تھی میں نے 10 سال شادی کا انتظار کیا۔ اس لمحہ کا انتظار کیا جب میں اپنی زندگی جی سکوں گی لیکن میں زندگی کے معنی سے قطعی نا آشنا ہوتی جا رہی تھی۔ عمر اپنے کام میں مگن تھے۔ انہیں صرف پیسے بنانے سے دلچسپی تھی، گھر بنانے کی، فیملی بنانے کی پرواہ انہیں نہیں تھی۔ مجھے کبھی کبھی لگتا تھا مجھے کسی جرم میں عمر قید ہو چکی ہے۔ اس قید میں واقعی عمر گزرنے والی تھی.........

.........

''عمر ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔'' میں ایک روز ڈرتے ڈرتے بولی۔

''ہاں۔''

عمر کیا یہ ممکن ہے کہ ہم کسی ڈاکٹر کے پاس جائیں۔

کس لیے۔

عمر ہماری شادی کو کافی عرصہ گزر چکا ہے لیکن بچے.........

''میں کیوں جاؤں؟ تم جانا چاہتی ہو تو چلی جاؤ......''

وہ یہ کہہ کر آناً فاناً کمرے سے نکل گئے۔

.........

بی بی بظاہر تو آپ کی رپورٹس ٹھیک ٹھاک ہیں، لیکن بہتر یہی ہوگا کہ آپ اپنے میاں کا بھی چیک اپ کرالیں۔ Make sure کرنے کے لیے کہ سب ٹھیک ہے۔

ڈاکٹر کے مشورے کے بعد میں نے عمر سے کئی بار کہا لیکن عمر کو وقت نہیں تھا۔ یا وہ جانا ہی نہیں چاہ رہے تھے، میں نہیں جانتی بس وہ نہیں گئے۔

میں محبت کی پیاسی تھی، پیاس پوری نہیں ہو رہی تھی سوسوکھی جا رہی تھی۔

ایسے میں ایک روز میری ملاقات اس سے ہو گئی اور پھر نہ جانے کیوں میں اس کی جانب کھنچتی چلی گئی، یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کا انجام کیا ہو سکتا ہے؟

وہ ہر روز مجھے ملنے آتا تھا، آتے ہوئے میرے لیے گلاب لانا کبھی نہ بھولتا تھا، میری جانب دیکھتا تھا تو میں خود کو مدہوش محسوس کرتی تھی، وہ میٹھی میٹھی آواز میں میرے کان میں سرگوشی کرتا تھا تو میں جھرجھرا جاتی تھی۔ میرے وجود سے مجھے اس کی مہک آنے لگی تھی مجھے اتنا سکون عمر کے ساتھ آج تک نہیں مل سکا تھا جتنا میں اس کے پاس محسوس کرنے لگی تھی۔ اس کی آواز سن کر میری صبح ہوتی تھی اس کا چہرہ دیکھ کر میری شام.........

وہ مجھے جیتتا جا رہا تھا اور میں اس کے آگے خود کو ہارتی جا رہی تھی۔

وہ مجھے ایک روز شہر کے شاپنگ مال میں ملا تھا۔ مجھے واپسی پر ڈرائیور نے لینے آنا تھا لیکن عمر نے اسے کسی اور کام سے بھیج دیا تھا ایسے میں شایان نے مجھے گھر تک چھوڑا تھا تو میں اُسے چائے کا بول کر اندر لے آئی پھر وہ وہاں سے بھی

نہیں گیا، کہیں نہیں گیا۔

..........

عمر میری کالج کی کچھ فرینڈز جو مجھے حال ہی میں بہت سالوں بعد ملی ہیں گھومنے جا رہی ہیں، کیا میں ان کے ساتھ جا سکتی ہوں۔

ہاں چلی جاؤ......

''ایک ہفتہ کا پروگرام ہے۔''

''ٹھیک ہے۔''

عمر کو مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی تو میری سہیلیوں سے کیا ہوتی؟ اسے پروانہیں تھی، یہ جاننے میں بھی دلچسپی نہیں تھی کہ میں آخر کن کے ساتھ جاؤں گی اور کہاں جاؤں گی۔

..........

وہ سات دن میری زندگی کے بہترین دن تھے۔ شایان کے ساتھ، اس کی بانہوں میں جھولتے ہوئے میرا سارا وجود مہکنے لگا تھا۔ میں بولتی تو وہ گھنٹوں میری باتیں سنتا۔ ابا کی باتیں، امی کی باتیں، بہن کے قصے، بھائیوں کی کہانیاں اسے میری ہر بات سے دلچسپی تھی۔ وہ سنتا تھا اور مسکراتا تھا۔

وہ کون تھا، کس خاندان سے تھا، ہمارا رشتہ کیا تھا، مجھے ان ساری باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں جو کہ صرف توجہ کی طلبگار تھی مجھے سوائے اس کے کچھ نہیں چاہیے تھا۔ وہ سات دن تھے یا سات پل میں نہیں جانتی، لیکن میں اتنا ضرور جانتی ہوں کہ وہ دن میری پوری زندگی کا اثاثہ تھے۔ میری عمر بھر کی تنہائی دور کرنے کو کافی تھے وہ سات دن۔

..........

واپسی پر بھی عمر کا رویہ ویسے ہی تھا۔ مجھے اس سے توقع نہیں تھی، لیکن پھر بھی ایک اندازہ تھا، خواہش تھی یا خیال کہ شاید وہ مجھ سے تڑپ کے میرے بارے میں کچھ کہے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ مگر پھر وہ بھی نہیں ہوا جو پچھلے کئی دنوں سے ہو رہا تھا۔

اس کے بعد شایان دوبارہ نہیں آیا..........

وہ جس طرح مجھے ملا تھا اسی طرح کھو گیا۔ اس کا موبائل مسلسل بند جا رہا تھا۔ میرے پاس اس کے گھر کا نمبر نہیں تھا۔ دفتر کا تھا جہاں فون کیا تو پتہ چلا وہ وہاں سے استعفیٰ دے کر جا چکا ہے۔ میں ٹوٹتی گئی۔ مجھے کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں بھری جوانی میں بیوہ ہو چکی ہوں۔

''کیا شایان کے لیے میں محض وقت گزاری کا ذریعہ تھی۔'' میں خود سے سوال کرتی تھی۔

ہاں اور نہیں تو کیا، اس نے تم سے کوئی وعدہ تو نہیں کیا تھا۔ تم تو خود ہی اپنا وجود اسے سونپتی جا رہی تھیں۔ وہ وقت گزاری نہ کرتا تو اور کیا کرتا۔

وقت رکتا نہیں ہے۔ اس کی یہی بات شاید سب سے اچھی ہے۔ وقت آگے بڑھتا ہے تو بہت کچھ بدل جاتا ہے۔ میں بھی بدل گئی تھی۔ میں عمر کے ساتھ رہ رہ کر عمر جیسی ہو گئی تھی۔ وہ مجھ سے بیگانہ تھا اور میں اس سے بے خبر۔

اب میں نے ڈرائیور کے ساتھ جانے کے بجائے خود ہی گاڑی چلانا شروع کر دیا تھا۔ میرے انداز اب خود ہی بدلتے جا رہے تھے۔ اب میں وہ دقیانوسی نہیں رہی تھی جیسی میں تھی۔ میری زندگی میں اب کئی لوگ شامل تھے۔ ردا، فرحان، ضیاء۔

ٹرن ٹرن ٹرن۔

Per night کیا ریٹ ہے؟

سوری رانگ نمبر، میں نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔ فون پھر سے بجا۔

ٹرن ٹرن ٹرن۔

ہیلو۔

یہ رانگ نمبر نہیں ہے۔ بالکل ٹھیک نمبر لگایا ہے۔

جی بتائیے کیا چاہیے آپ کو۔

Per night rate۔ وہی بات دہرائی گئی۔

میں سمجھی نہیں کس چیز کا ریٹ پوچھ رہے ہیں آپ؟

ارے تیرا اور کس چیز کا ریٹ پوچھ سکتے ہیں۔ تیرے پاس اور کوئی مال بھی ہے کیا؟

میں کانپ گئی، نہ جانے کتنی دیر میں شاخ کی طرح لرزتی رہی۔ شیشے میں مجھے اپنا عکس ننگا نظر آ رہا تھا اور میرے ماتھے سے اب بھی خون رس رہا تھا۔

امریکہ (نیویارک) میں مقیم
ممتاز شاعرہ اور افسانہ نویس
انیلہ بھٹکر کے افسانوں کا پہلا مجموعہ
''نہیں''
مکمل اہتمام سے شائع ہو گیا ہے
ناشر
نستعلیق مطبوعات
الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور
0300-4489310 / 0423-7351963

افسانہ

# خواب کی تعبیر

بی بی حلیمہ بشریٰ/کوٹ

شدید بخار اور درد کے مارے اس کے پور پور پر جیسے کوئی جلتے ہوئے کوئلے رکھ کر بھول گیا ہو۔ اُس کے دائیں جانب ایک پرانے ٹوٹے پھوٹے میلے سے بینچ پر اس کے امی ابو بے بسی کی تصویر بن کر بیٹھے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ اُس کے چہرے پر ہلکی سی اُداسی کی سلوٹ اُس کے ماں باپ کے لیے تلوار کا وار بن جائے گی۔

افسردگی اور یاس کے مجسمے بنے اُس کے ماں باپ کے دل میں موجزن درد کے سمندر کی موجیں آنسو بن بن کر اُن کی آنکھوں کی دہلیز پر کھڑے اندھا دھند دستکیں دے رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ایک سانولی سی تیکھے نقوش والی نرس جس کا لہجہ اُس کے نقوش سے کچھ زیادہ تیکھا اور تلخ تھا...... آئی اور اس نے بچی کا منہ کھولا اور اس کے حلق میں ڈاکٹر کی تجویز کردہ دوائی کے دو چمچ ڈالے لیکن اس سیرپ کا ذائقہ نرس کے لہجے اور نقوش سے زیادہ تلخ تھا۔ بچی نے تلخی کے مارے آنکھیں بند کرلیں اور کچھ دیر تک بے چینی کے عالم میں کروٹیں بدلتی رہی اور تقریباً ۵ منٹ بعد غنودگی کی زبردست لہر سے وہ نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ اس کے سکون سے سو جانے سے اُس کے ماں باپ کو قدرے تسلی ہوئی۔

یہ کس خطا کی سزا ہمیں دے رہا ہے پروردگار تو ہمیں معاف فرما...... اُس کی ماں نے بھرے ہوئے لہجے میں کہا۔

حوصلہ رکھئے ایقا کی ماں...... ہماری گڑیا سو گئی اب تھوڑا سا سکون مل جائے گا...... ایقا کے ابو نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

تقریباً دو گھنٹے گہری نیند کی چادر اوڑھے ایقا سوئی رہی اور دو گھنٹے آرام کے بعد واقعی اُس کے بدن میں موجزن درد کی لہریں بیٹھ سی گئی تھیں۔ اسی لیے اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ کی کرن سے اُس کے ماں باپ کی آنکھوں میں بے پناہ خوشی کی لہریں دوڑ گئیں۔

ایقہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی مگر جتنی زیادہ وہ لاڈلی تھی اتنی ہی زیادہ وہ عام بچوں سے مختلف تھی اور بہت زیادہ حساس اور ذہین تھی۔ اتنی حساس کہ غم کی ہلکی سی لہر سے اُس کا بدن برف کی طرح پگھل جاتا بلکہ چھوٹی خوشی سے اس کا پورا وجود تازہ گلاب کی مانند کھل اُٹھتا۔

بیڈ کے داہنے جانب میز پر رکھے پانی کے گلاس سے پانی کا ایک بڑا گھونٹ لیتے ہوئے اُس کی ماں نے کہا ''اب کیسی ہے میری گڑیا؟

ٹھیک ہوں مما جانی...... ایقہ نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا...... اُس کے حلق سے جیسے کوئی کھینچ کھینچ کر آواز نکال رہا ہو۔

اتنے میں ڈاکٹر وارڈ میں داخل ہوا اور سیدھا ایقہ کے بیڈ کی جانب آیا۔ اُس کی کھنکار نے وارڈ میں موجود تمام نرسوں اور مریضوں کو اپنی طرف متوجہ کیا...... اور تمام نرسیں ڈاکٹر کی جانب لپک کر اُس کے دائیں بائیں دست بستہ کھڑی ہو گئیں۔

ابھی گڑیا قدرے بہتر ہے سید صاحب......

ڈاکٹر نے دایاں ہاتھ ایقہ کی پیشانی اور بایاں ہاتھ سید صاحب کے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

ایقہ کی نظریں اُوپر جگہ جگہ ٹوٹے چھت، بوسیدہ دیواروں اور میلے کچیلے فرش سے ہوتے ہوئے ڈاکٹر کے چہرے پر جم گئیں اور ہلکی سی آواز میں کہا ''بہت دم گھٹ رہا ہے، مجھے تھوڑی دیر کے لیے باہر لے جائیں ڈاکٹر انکل۔'' ایقہ نے تین سانسوں میں یہ چھوٹا سا فقرہ کہا......

سسٹر اسے باہر چمن میں لے جاؤ...... ڈاکٹر نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

لیس سر ابھی لے جاتی ہوں...... نرس نے کہا اور کچھ ہی دیر میں نرس نے اسے باہر لے جا کر لان میں بٹھا دیا اور دبے پاؤں وارڈ کی جانب چلی گئی۔

ایقہ نے دونوں پاؤں طے کر لیے اور اپنی ہاتھوں کی دونوں کہنیاں دو ستونوں کی طرح کھڑی کر کے اپنی دونوں ہتھیلیوں کے درمیان اپنا چہرہ تھام لیا اور بڑی بڑی آنکھوں کی لمبی لمبی پلکوں کی

حرکت تھوڑی دیر کے لیے ساکت کر کے آسمان کو تکنے لگی۔

آسمان پر چھوٹی چھوٹی بدلیوں کے ٹکڑے کسی مجذوب فلسفی کے منتشر خیالوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ مگر باقی فضا بالکل صاف تھی۔ ہوا کے صحت مند جھونکے درختوں کی شاخوں کے جوڑ کھول کھول کر کسی ناتواں پتے کی زمین بوسی کا سبب بن رہے تھے...... تو درختوں پر بیٹھے پرندے اُڑ اُڑ کر مختلف دائرے بناتے...... ایقہ مکمل طور پر اس روح افزاء منظر میں ڈوب گئی تھی۔ وہ باقی بچوں سے مختلف تھی...... بالکل مختلف...... بلکہ یونیق...... وہ ان پرسکون مناظر کو ہمیشہ کے لیے اپنے قریب دیکھنا چاہتی تھی اور ایک گہری سوچ میں ڈوب گئی کہ کیا میں کبھی ان کی تصویریں بنا پاؤں گی؟

وہ فطرت کو اپنا سب سے بڑا دوست مانتی۔ وہ بچپن سے ہی جاگتی صبح خدا کی صفت میں چہکتے پرندوں، نکلتے سورج کی نویلی کرنوں، بے زبان جانوروں، اِدھر اُدھر اُڑنے والی تتلیوں، باغ میں بلبلوں کے دل سوز نغموں، ٹمٹماتے تارے اور رات کی کالی چادر اوڑھے چمکتا چاند یہ سب اُس کے بہترین دوست، اس کی تنہائیوں کے ساتھی، اس کے غم خوار اور اس کے ہم راز تھے۔ ان سب کے ساتھ اس کی گہری دوستی تھی۔

اس کے دل میں خواہش اُبھرتی کہ اُس کے یہ سب دوست ہمیشہ اس کے ساتھ رہیں۔ وہ ان کی کہانی بن کر اُن کی دوستی کو امر کرنا چاہتی تھی۔ وہ ایک کہانی کار بننا چاہتی تھی۔

جھومتے درختوں کو دیکھ دیکھ کر اس کے دل میں یہ خواہشات انگڑائیاں لیتیں کیا کبھی میں ان آزاد فضاؤں میں ان کی طرح جھوم سکوں گی؟

اُڑتے پرندوں کی ٹولیوں کو دیکھ دیکھ کر وہ سوچتی رہی کہ کبھی میں ان بلندیوں میں اُڑ سکوں گی؟ سوچتے سوچتے اس پر نیند کا غلبہ ہوا۔ وہ پرندہ بن کر طیور آوارہ کے سنگ اُڑ چلی۔

وہ رنگ برنگے پرندوں کے ساتھ اُڑ رہی تھی۔ ان مختلف النوع پرندوں کے ساتھ اُس نے فضا کی بھرپور بلندیوں کو مسخر کیا۔

ساری دنیا اس کے پروں کے نیچے تھی۔ نفرتوں، مصیبتوں، خودغرضی اور دکھوں بھری دُنیا اُس کے پروں کے نیچے تھی اور وہ اونچی اُڑان اُڑ رہی تھی۔

اچانک اپنے ماتھے پر اپنے باپ کا وزنی ہاتھ پاکر بیدار ہوئی۔

''میری ننھی منی جان ادھر ہی سوگئی تھی''

لیکن آج جب ایقہ کے بابا نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور اسی انداز کا فقرہ دہرایا۔

''اُٹھو بابا کی جان سورج سر پر آ گیا ہے یونیورسٹی نہیں جانا'' اس کے بابا نے نہایت اطمینان سے کہا۔

اب اس کے ہاتھ میں وزن اور بھاری پن نہیں تھا لیکن چہرے پر غیر معمولی بشاشت اور آنکھوں میں گہرے اطمینان کی شوخ چمک ضرور تھی۔

''ہائے بابا جانی اتنا اچھا سپنا دیکھ رہی تھی کہ آپ نے جگا دیا'' ایقہ نے شرارت بھری نظروں سے بابا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

کیسا سپنا میری جان؟ بابا نے کہا۔

وہی سپنا بابا جانی جو میں نے ۱۷ سال پہلے ہسپتال کے لان میں دیکھا تھا اور آپ لوگوں کا مضبوط سہارا بننے کے لیے اونچی اُڑان اُڑنے کی خواہش کی تھی۔ ایقہ نہایت شوخ لہجے میں بولی۔

ہمیں تم پر فخر ہے میرے بیٹے...... آنکھوں میں بے پناہ چمک لیے بابا نے کہا۔

بابا چلے گئے ایقہ بیڈ سے اُٹھی، پردہ ہٹایا، کھڑکی کھولی اور نیچے دیکھنے لگی۔ مختلف کیاریوں اور گملوں میں لگے تازہ پھول، اُس پر اُٹھتی بیٹھتی رنگین تتلیاں، تناور درختوں پر شور مچاتے پرندے۔ حتیٰ کہ اُس کے بچپن کے سبھی دوست اپنے اپنے انداز میں اُسے مبارک باد دے رہے تھے۔

پورے ۱۷ سال کی دن رات کی انتھک محنت کے بعد اسے یہ مقام حاصل ہوا تھا۔

اس تمام عرصے میں وہ کتابوں کو اپنا اوڑھنا بچھونا بناتی رہی۔ ہر دکھ اپنے سینے کے قبرستان میں دفناتی اور ہر خوشی ماں باپ کے قدموں میں رکھتی۔ اس کے ماں باپ اللہ کے حضور سجدوں میں گر گر کر اس کی کامیابیوں کی دُعا مانگتے۔

تمام دعائیں قبول ہوئیں۔ آج دنیا کی ہر آسائش اُس کے قدموں میں تھی۔ کیونکہ وہ ڈاکٹر ایقہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نامور کہانی کار بھی تھی۔

اس کے سپنوں کو تعبیر مل گئی......

افسانہ

# خشک بیل پہ مرجھائی آنکھیں

شہزاد ملک/خیر پور ٹامیوالی

آسمان نے کالا غلاف اوڑھ لیا اور ستارے بے چینی سے چاند کا انتظار کرنے لگے۔ اکثر رات میں جاگنے والوں کی آنکھوں میں انتظار ایک سخت حاکم کی طرح موجود ہوتا ہے۔

آنکھ وہ محل ہے جہاں نیند کی دیوی آ کے آرام کرتی ہے......!

مگر یہ سخت حاکم انتظار نیند کی دیوی کو محل کے دروازے (پلکوں) پہ ہی روک لیتا ہے۔ تبھی رات کو جاگنے والوں کی آنکھوں میں ہلکی سی خماری اور انتظار ہوتا ہے۔

سورج انگڑائیاں لیتا ہوا آسمان پہ نمودار ہوا اور پرندے صبح کا نغمہ گانے لگے۔ ایک چوراہے پہ دو اجنبی مسافر پُر امید نظریں اپنی اپنی منزل کو جانے والے راستے پہ لگائے روانہ ہو گئے۔

اسلام آباد کی خوبصورت سڑکوں کو دیکھ کر یوں گمان ہوتا ہے جیسے کوئی سگھڑ دوشیزہ روز یہاں آکر صفائی کر جاتی ہے۔

نیلام گھر میں نیلامی کی تیاریاں مکمل ہو رہی ہیں اور خریداروں کی بھی کافی تعداد جمع ہو گئی ہے۔ یہاں بہت سی پرانی اور نایاب چیزوں کی نیلامی ہوتی ہے جن میں آج خاص پینسٹھ برس پرانا سونے کا سکہ ہے۔ بھی خریدار آ گئے چاچا جند بخشا بھی اسٹیج کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ مختلف چیزوں کی نیلامی کے بعد سکے کی نیلامی شروع ہوئی۔

بولی فروش نے بولی بڑھائی...... ایک لاکھ!

آخری لائن میں بیٹھے شخص نے بولی بڑھائی ایک لاکھ پچاس ہزار...... یوں سب نے اپنی اپنی حیثیت برابر بولی لگائی...... ایک صاحب نے بولی لگائی پچاس ہزار...... اور سب طنزیہ ہنستے ہوئے اسے دیکھنے لگے......!

ایک نوجوان نے بولی بڑھاتی تین لاکھ......

ایک دم سے سناٹا چھا گیا اور سب حیرت سے اُس کو دیکھنے لگے۔ اسٹیج پر موجود دلال نے بولی دہرائی...... تین لاکھ ایک...... تین لاکھ دو...... تین لاکھ تین...... مگر ہر طرف خاموشی رہی اور وہ سکہ اُس نوجوان نے خرید لیا اور چاچا جند بخشا اُمید بھری نگاہوں سے کبھی سکے اور نوجوان کو دیکھتا رہا۔

مایوس قدموں سے وہ اسی راستے پہ لوٹ آیا۔ چوراہے کے قریبی پارک کے بنگلے کے ساتھ لگے ہوئے بینچ پر بیٹھ گیا۔ مگر ابھی دوسرا مسافر نہیں آیا تھا۔

''تم اندھے ہو یا پاگل......؟ تم نے سوچا کیسے کہ تمہیں یہاں نوکری مل جائے گی۔ تم لولے لنگڑے بھی ہوتے تو نوکری دے دیتا۔ اپنی آنکھیں دیکھی ہیں کیا خبر ٹھیک سے نظر آتا بھی ہے یا نہیں......؟ میرا منہ کیا تک رہے ہو چلو نکلو یہاں سے۔''

ہونٹوں پہ زبردستی مسکراہٹ سجائے وہ خود کو دلاسہ دیتے ہوئے اُٹھا۔ اُسے یہ سب برا نہیں لگا۔ کیونکہ اب تو اسے ان باتوں کو سہنے کی عادت ہو گئی تھی۔

وہ وہاں سے اسی رستے پر لوٹ آیا لیکن آج اس کا پورا جسم مایوسی میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ اپنے جسم میں اُمید کو تلاش کرنے لگا اور اُمید اُسے ملی بھی تو کہاں......؟ جوتے کے تلوے میں...... جو کہ تقریباً گھس چکا تھا۔ اس نے موچی سے جوتے کو سلوایا اور گھسی ہوئی اُمید کو تھوڑا آسرا مل گیا۔

''شام نے پردہ گرا دیا اور رات ہولے ہولے سے آسمان پر پھیلنے لگی...... آج آسمان کا منظر ایسا تھا جیسے کوئی کنارہ لگانے والی لڑکی نے کالے رنگ کے جوڑے پر بہت ہی نفاست سے ستارے جڑ دیے ہوں۔ بنگلے کے ساتھ لگے اسی بینچ پر وہ بیٹھ گیا جہاں چاچا جند بخشا بیٹھا تھا...... کچھ پل خاموشی رہی اور وہ اپنے اندر نجانے کیا کیا تلاش کرتے رہے۔ اس نے چاچے سے کہا ''آپ آج مجھے اس بادشاہ کی طرح اُداس لگ رہے ہیں جو جنگ میں اپنی سلطنت ہار جاتا ہے''

چاچے نے بھری ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور کہا ''میں آج اسی برس کا ہو گیا ہوں اور میرا خیال ہے میں بہت نایاب ہوں۔ ہفتے میں ایک بار نیلام گھر جاتا ہوں جہاں قیمتی اور نایاب چیزوں کی نیلامی ہوتی ہے لیکن کسی کی نظر مجھ پر نہیں پڑتی کہ میں بھی تو بہت پرانا ہوں۔ میرے اندر نایاب علم اور تاریخ کے وہ دن ہیں جو آج

تک کتابوں میں آشکار نہیں ہو سکے۔ کوئی مجھے مفت میں بھی ساتھ لے جانے کو تیار نہیں۔ مگر تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں؟ آج ایک سونے کے سکے کی نیلامی ہوئی اور وہ سکہ میرے ان ہاتھوں سے بنایا ہوا تھا...... لیکن سب سے زیادہ دُکھ...... راز کی بات ہے غور سے سنو۔ نوجوان جس نے سکہ خریدا وہ میرا پوتا تھا۔

کیا بوڑھی چیزیں نایاب ہوتی ہیں؟ کیا بوڑھے انسان قیمتی نہیں ہوتے......؟

وہ خاموش رہا اور اس کی آنکھیں بھی جا رہی تھیں۔ کافی وقت کے بعد بھی پانی نہ تھما تو چاچے نے اس سے پوچھا نوجوان یہ تمہاری آنکھیں ہر وقت نم کیوں رہتی ہیں؟ وہ آہ بھرتے ہوئے بولا مجھے آنکھوں کی بیماری ہے جسے آشوب چشم کہتے ہیں۔ کچھ پل دونوں خاموش رہے اور نوجوان ہچکی لیتے ہوئے بولا ''بچپن میں سوچا کرتا تھا جب آسمان پہ بادل آ جاتے ہیں تو بادل اور آسمان کے درمیان کیا ہوتا ہے تو ماں کہا کرتی تھی ''بیٹا بادلوں کے اوپر پریاں آ جاتی ہیں جو زمین سے ہمیں نظر نہیں آتی۔''

میں تجسس سے پوچھتا ''ماں پھر یہ بارش کیوں آتی ہے؟''

تو ماں کہا کرتی ''بیٹا جب پریاں نہاتی ہیں تو پاوتر پانی نیچے گرتا ہے جسے لوگ بارش کہتے ہیں۔''

اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور کہا ''چاچا میری آنکھوں میں بھی اک پری ہے جب وہ نہاتی ہے تو پاوتر پانی میری گالوں پہ بہہ جاتا ہے۔ جسے لوگ آنسو کہتے ہیں......!''


نامور مزاح نگار، سفرنامہ نگار
کالم نویس اور شاعر
ڈاکٹر سلیمان عبداللہ ڈار کا
سعودی عرب، سری لنکا، مال دیپ
ملائیشیا، سنگاپور، تھائی لینڈ اور
جنوبی افریقہ کی سیاحت پر مشتمل
منفرد سفرنامہ
''مسافر ہوں یارو''
مکمل اہتمام کے ساتھ شائع ہو گیا ہے
ناشر
نستعلیق مطبوعات
الفیر وز سنٹر غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور
0300-4489310 / 0423-7351963



''بھر دو جھولی مری یا محمدؐ'' کے خالق
حمد، نعت اور غزل کے شہرہ آفاق شاعر
پرنم الہ آبادی (مرحوم) کا غیر مطبوعہ کلام
بے وفا سے بھی پیار ہوتا ہے
کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہو گیا ہے
مرتب: محمد اقبال پیام شجاع آبادی
ناشر
ادبستان میلہ رام نزد داتا دربار لاہور



پہلے پنجابی شعری مجموعے
دو ہنگے پانی کے بعد لاہور میں مقیم شاعر
نازاوکاڑوی کا دوسرا شعری مجموعہ
ڈوہنگے ٹوئے
جلد شائع ہو رہا ہے
مکتبۂ فجر
الفیر وز سنٹر غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور



ٹیکسلا واہ کینٹ میں مقیم معروف شاعرہ
شکیلہ ستارہ کے مرتب کردہ انتخاب
بیت بازی
اور
بے مثال بیت بازی
کے بعد اُن کا پہلا شعری مجموعہ
ٹوٹا ہوا تارا
جلد شائع ہو رہا ہے
ناشر
نستعلیق مطبوعات
الفیر وز سنٹر غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور
0300-4489310 / 0423-7351963

افسانہ

# اسپورٹس گرل

دستگیر شہزاد/ٹوبہ ٹیک سنگھ

کسی شاعر نے ٹھیک ہی کہا ہے ''کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا'' اسی لیے انگریز بیوی کو Better Half) نصف بہتر کہتے ہیں۔ کیونکہ بیوی کبھی بھی مکمل طور پر بہتر نہیں ہوتی۔ بلکہ اپنے شوہر کے لیے تو وہ نصف برتر ہوتی ہے۔ باقی نصف جہاں کے لیے بہتر۔ اب ہماری بیگم کو ہی لیجیے ہم نے شادی سے پہلے کیا کیا سپنے دیکھے تھے۔ زہرہ اور مریخ پر تصورات کے محل بنائے تھے۔ چاند سا مکھڑا اور تاروں سی بندیا کا سوچا کرتے تھے۔ یعنی پوری کائنات اپنی ہونے والی بیگم میں تلاش کرتے تھے۔ ہمیں شروع سے ہی اچھے ڈیل ڈول والی لڑکیاں پسند تھیں۔ اس زمانے میں ثانیہ مرزا پرائمری میں پڑھ رہی ہوگی۔ جب ہم ٹینس اسٹار مارٹینا نورتیلووا کو ٹی وی پر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے تھے۔ ہمیں بھی دوسرے پاکستانیوں کی طرح ٹینس کی بالکل سمجھ نہیں ہے۔

ہم تو صرف مارٹینا کے کسرتی بدن کی وجہ سے ٹینس دیکھا کرتے تھے۔ دراصل ٹینس ہمارا پسندیدہ کھیل رہا ہے۔ اگر آپ اے سرٹیفکیٹ والی فلمیں نہیں دیکھ سکتے اور حسن کا کچھ کھلا کھلا دیدار کرنا چاہتے ہیں تو خواتین ٹینس کھلاڑیوں کو دیکھیے۔ کوئی شک بھی نہیں کرے گا کہ آپ عریانیت سے محظوظ ہو رہے ہیں۔ بلکہ آپ کے ذوق کی داد دی جائے گی کہ انگریزوں کے کھیل کی آپ کو کتنی سمجھ ہے۔

ہماری اماں کو جب پتہ چلا کہ ہمیں کسرتی بدن والی خواتین زیادہ ہی بھاتی ہیں تو ہماری ہونے والی نصف بہتر کے طور پر ایسی ہی لڑکی کی تلاش شروع کر دی اور ہمیں اس قسم کی نیم پہلوان لڑکی مل بھی گئی۔ ہماری بیگم اسکول کی بہترین اسپورٹس گرل تھی۔ اسے کنگ فو، جوڈو، کک باکسنگ، کشتی، لانگ جمپ، ہائی جمپ اور ڈسکس تھرو میں کئی انعامات مل چکے تھے۔

ہمیں ان کا فوٹو بھی دکھایا گیا جس میں وہ میچ جیتنے کے بعد پسینے پسینے سر پر بینڈ باندھے مٹھی بند کر کے بڑے قاتل انداز میں کھڑی تھیں۔ ہم تو فوٹو دیکھ کر خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ ہمیں اپنے سپنوں کی مارٹینا مل چکی تھی۔ لڑکی کو ہمارا فوٹو دکھایا گیا تو اس نے بھی مشرقی لڑکی کی طرح والدین کی پسند کو اپنی پسند سمجھا اور ہم سے شادی کر لی۔ وصل کی رات میں ہی گھونگھٹ اُٹھانے کے بعد اس نے تحکمانہ لہجے میں کہہ دیا اب ہم آپ کو سنبھالنے آ گئے ہیں۔ آپ صرف ہمارے ہیں۔ ہم قطعی برداشت نہیں کریں گے کہ آپ کسی اور کو دیکھیں...... دیکھیں کیا ذکر بھی کریں۔ ہم بھی پہلی نظر کے پیار میں اندھے ہو گئے تھے اور ہم نے خدا کو حاضر ناظر جان کر ان کی ہدایت پر عمل کرنے کا وعدہ دے دیا۔ شادی کا پہلا مہینہ تو بڑے آرام سے گزرا۔ کبھی ان کے گھر ہماری دعوت اور کبھی ہمارے گھر ان کی دعوت۔ اس لیے ہمیں پتہ نہیں چلا لیکن ایک مہینے کے بعد ہی ہماری اسپورٹس گرل نے ہمارا ٹائم ٹیبل بنا کر ایک ڈوری میں باندھ کر گلے میں لگا دیا کہ ہمیں کس وقت کیا کرنا ہے۔ گھر سے ہمارے دفتر کا راستہ پندرہ منٹ کا ہے۔ ہمیں تاکید کر دی گئی کہ صبح نو بجنے میں پندرہ منٹ پر گھر سے نکلیں گے اور شام چار بج کر پندرہ منٹ پر گھر پہنچ جائیں گے۔ اپنے دفتر میں کام کرنے والی خواتین کو صرف سلام کریں گے دعا نہیں۔ راستے میں اِدھر اُدھر نہیں دیکھیں گے۔ ناک کی سیدھ میں دیکھتے ہوئے سیدھے چلتے ہوئے پندرہ منٹ میں گھر پہنچ جائیں گے۔ ہم تو بیگم کو اپنے خوابوں کی مارٹینا سمجھ رہے تھے اور اماں کے بڑے احسان مند تھے کہ انہوں نے ہماری پسند کو ترجیح دی لیکن شادی کے ایک مہینے بعد انکشاف ہوا کہ اماں نے ہمارے خلاف سازش کی تھی۔ دراصل ہم بھی اپنے والد کی طرح عاشق مزاج واقع ہوئے ہیں۔

اور خدا کی تمام مخلوق میں عورت کو بہترین تخلیق مانتے ہیں اور خوب صورت عورتوں کو دیکھ دیکھ کر خدا کی کبریائی بیان کرتے ہیں۔ ہماری خفیہ الماری میں حسینوں کے فوٹو، خط، فون نمبر، تحفے، پھول، رومال، براس لیٹ اور گریٹنگ کارڈ بڑے سلیقے سے رکھے ہوئے ہیں۔ اپنے دفتر کے علاوہ

آس پڑوس میں ہماری کئی خاتون دوست ہیں اور سچ بتائیں خواتین کو ہم جنت کے پھول سمجھتے ہیں اور ان پھولوں کے بیچ ہمیں آکسیجن ملتی ہے اور زندگی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اماں نے ہماری عاشق مزاجی اور حسن پرستی پر لگام لگانے کے لیے ہی اسپورٹس گرل تلاش کر لی۔ تاکہ وہ ہماری حرکتوں سے ہمیں باز رکھنے کے لیے کبھی کبھار ہم پر ہاتھ بھی صاف کر دے۔ ہم بڑی رازداری سے آپ کو بتا رہے ہیں کسی سے کہیے گا نہیں۔ ہم دنیا کے ان چند خوش بخت شوہروں میں سے ہیں جنہیں نصف بہتر کے ہاتھوں پٹنے کا اعزاز حاصل ہے۔ مجال ہے ہم اپنی نصف بہتر کو ڈانٹ دیں یا آنکھیں دکھا دیں۔ فوراً آستین چڑھاتی ہوئی ہماری طرف بڑھتی ہیں اور ہم بھیگی بلی بن کر میاؤں میاؤں کرتے رہ جاتے ہیں۔

کیا بتائیں آپ کو کتنی ظالم بیوی ہمیں ملی ہے۔ اسے ساس بہو کے سیریلوں سے زیادہ ڈبلیو ڈبلیو ایف کی کشتیوں، باکسنگ کے مقابلے، جوڈو کراٹے اور ایکشن فلمیں زیادہ پسند ہیں۔ اس کے علاوہ کرکٹ، فٹ بال، والی بال، ہینڈ بال اور گلی ڈنڈے تک کا شوق ہے۔ کئی مرتبہ باکسنگ یا کشتی دیکھتے ہوئے اتنی جوش میں آ جاتی ہیں کہ اپنے ہاتھ پاؤں بھی چلانے شروع کر دیتی ہیں۔ کئی مرتبہ ہم ان کے مکوں اور لاتوں کا تختہ مشق بن چکے ہیں۔ ہماری آنکھ کے نیچے جو کالا نشان آپ دیکھ رہے ہیں وہ بھی بیگم کے گھونسے کا تحفہ ہے۔ جسے منہ پہ سجائے پھر رہے ہیں۔ جن دنوں کرکٹ کا ورلڈ کپ چل رہا ہو یا فٹ بال کے لیگ میچز ہو رہے ہوں بیگم ٹی وی کے سامنے جمی رہتی ہیں۔ لگتا ہے وہ ٹیم کی بارہویں کھلاڑی ہے یا کھلاڑیوں کا حوصلہ بڑھانے اور ناظرین کا دل بہلانے والی چیئر گرل ہیں۔ ان دنوں ہمیں خود کھانا پکانا پڑتا ہے۔ بیگم چپس اور کولڈ ڈرنک کا دو لٹر والا پیکٹ لے کر بیٹھ جاتی ہیں۔ مجال ہے کوئی شے ان کے اور ٹی وی کے درمیان ایک سیکنڈ کے دسویں حصے کی مدت میں بھی خلل انداز ہو۔ یہی نہیں ان کے تینوں موبائلوں پر دوستوں کے ساتھ لگائی شرطوں، نئے اسپورٹس گپ شپ چلتی رہتی ہیں۔ موبائل ہمارے پاس بھی ہے لیکن اس پر صرف ان کمنگ ہے۔ ہم بے چارے کی طرح آؤٹ گوئنگ کی سہولت نہیں ہے۔

شام کے وقت پرانی انارکلی کی طرف جاتے ہیں تو لاہور کا حُسن دوکانوں اور خوانچے والوں کے پاس دیکھ کر دل اور جیب مسوس کر رہ جاتے ہیں اور تمنا کرتے ہیں کہ کاش ہم بھی چوڑی والے یا بساطی ہوتے یا امرود کا ٹھیلا ہی ابا جی نے لگوایا ہوتا اور ہم بھی مفت میں دیدارِ حسن کرتے۔ نجانے ہمارے ابا میاں نے کیوں اتنا روپیہ اور وقت خرچ کر کے ہمیں پڑھایا اور قلم ہاتھ میں تھما کر کاغذ سیاہ کرنے میں لگا دیا۔ ہم سے بہتر تو چوڑی بازار اور بھلاں والا چوک کے دوکاندار ہیں جو دوکانداری کے ساتھ ساتھ دل بھی بہلاتے ہیں۔

شادی کے شروع میں تو ہم نے راستے میں رکشوں کی آڑ لے کر دھیرے دھیرے چلتے ہوئے پرانی انارکلی کے حسن سے آنکھوں کو گرمانے کی کوشش بھی کی لیکن ایک دن ڈاکٹر آفاقی کلینک کے عین سامنے فوٹو گرافر کی دکان پر ہم ایک خاتون کو نہار رہے تھے کہ سفید برقعے میں پیک کسی بڑھیا نے پیچھے سے ایسا طمانچہ رسید کیا کہ آنکھوں طبق روشن ہو گئے۔ سخت ہاتھ کا لمس کچھ جانا پہچانا لگا اور ہم نے نیم بے ہوشی میں گھر کی طرف دوڑ لگائی۔ گھر آ کر ہم گدی پر آیوڈیکس کی مالش کر رہی رہے تھے کہ ہماری نظر صوفے کے پیچھے پڑے سفید برقعے پر پڑی جو ہمارے گھر میں تو کسی کا نہیں تھا۔ ہماری گھٹی ہوئی چیخ نکل گئیں۔ جبھی بیگم اپنا دایاں ہاتھ سہلاتی ہوئی آئیں اور انجان بن کر پوچھا کیا ہوا آپ کی گدی پر؟

ہم نے ہکلاتے اور تتلاتے ہوئے کہا بیگم قسم لے لو ہم فوٹو گرافر کی دوکان پر کسی بال رنگی عورت کو نہیں دیکھ رہے تھے۔ ہم تو صرف آپ کے خیالوں میں گم چلے آ رہے تھے کہ کوئی شیطان ہمارے کرکٹ بال مار کر بھاگ گیا۔ بیگم نے چیخ چیخ کر کے ہماری گردن پر اپنا سخت ہاتھ پھیرا۔ گردن کے خلیات تھوڑی دیر پہلے پڑے ہاتھ کے لمس کو پہچان گئے اور ہمیں دوبارہ طمانچہ پڑنے کا درد محسوس ہوا اور پھر چیخ نکل گئی۔ بیگم نے مصنوعی ہمدردی دکھاتے ہوئے کہا کیا واقعی بہت درد ہے؟ ہم نے مظلوم شکل بنا کر کہا ''جی ہاں!''

ان کے چہرے پر تمسخر عیاں تھا اور ہم تھر تھر کانپ رہے تھے۔ قسم کھا کر کہتے ہیں پندرہ دن آفس سے گھر تک آنکھیں زمین پر گاڑے چلتے رہے۔ مگر کسی مہ جبیں اور پردہ نشیں کی طرف نظر اُٹھا کر نہیں دیکھا لیکن فطرت سے مجبور ہیں کیا کرتے۔ پندرہ دن کے غور و خوض کے بعد آنکھیں

گرمانے کی ترکیب نکال ہی لی۔ آنکھوں میں تکلیف کا بہانہ بنا کر کالا چشمہ خرید لیا۔ اب ہم چشمے کے پیچھے سے قدرت کے حسین نظاروں کا لطف لیتے ہوئے آتے ہیں۔ جیسے ہی ہمارے محلے کی سرحد شروع ہوتی ہے ہم جیب سے ٹوپی نکال کر پہن لیتے ہیں اور تسبیح کے دانے گھمانے شروع کر دیتے ہیں۔

ہر ملنے والے کو سلام کر کے اس پر دم کرتے ہیں۔ بیگم بھی سمجھتی ہے کہ ہم انتہائی شریف ہو گئے ہیں۔ یہ تو تھے ہمارے گھریلو حالات۔ اب باہر ہماری بیگم کے رول کے بارے میں بھی سن لیجیے۔ ایک دن چاندنی چوک پر بھیڑ لگی ہوئی تھی اور کچھ لوگوں کی بھیانک چیخیں صدائے صحرا بنی ہوئی تھیں جیسے پولیس کے ٹارچر روم سے آتی ہیں۔ سینکڑوں کا ہجوم ایک اور ایک اور کہہ کر اس ظلم کے مزے لے رہا تھا۔ ہم نے فطری تجسس سے مجبور ہو کر لوگوں کے بیچ تھوڑی سی جگہ بنا کر ایک آدمی کی بغل کے نیچے سے منڈیا نکال کر دیکھا تو دو لفنگوں کی ایک پہلوان نما خاتون وہ پٹائی کر رہی تھی کہ لفنگے لوگ گڑگڑا گڑگڑا کر کہہ رہے تھے۔

بھائی، آپا، اماں، ابا جو بھی سن رہے ہو اب تو پولیس کو بلا لو۔ بس اب پٹائی برداشت نہیں ہوتی۔ ہائے مر گیا ارے میری آنکھ۔ لو دوسری پنڈلی بھی چٹخا دی۔ لفنگوں کو پیٹنے والی ہستی کچھ جانی پہچانی لگی۔ جب اس نے چہرے پر بکھرے بال ہٹا کر پسینہ پونچھا تو ہمارے نیچے سے زمین نکل گئی۔ وہ ہماری بیگم تھی اور اس کا وہ روپ ہم نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ جب تک لفنگے بے ہوش نہیں ہو گئے وہ پرانے قالین کی طرح انہیں پیٹتی پٹختی رہی۔

جب وہ بے دم ہو گئے تو لوگوں نے بیگم کی تعریف اور ان کی مردانگی کے قصیدے پڑھنے شروع کر دیے۔ کوئی دوڑ کر لسی کا گلاس لے آیا تو کسی نے لیمن کی بوتل کھلوا دی اور اور کوئی مظلوم عورت گھر کا پتہ اور ٹیلی فون نمبر پوچھنے لگی تو ہم چپکے سے کھسک لیے اور بیگم کے گھر پہنچنے سے پہلے ہی گھر پہنچ گئے اور وضو کر کے مصلے پر بیٹھ گئے۔ اسی طرح ایک دن ہم تھری وہیلر سے کہیں گئے وہاں کا کرایہ پچاس روپے بنتا تھا۔ تھری وہیلر والا سو روپے مانگنے لگا۔ ہم اُسے میٹر کے حساب سے بھائی صاحب بھائی کہہ کر سمجھانے لگے لیکن ہماری شرافت کو کمزوری سمجھ کر وہ بدتمیزی کرنے لگا۔ ہماری بیگم ساتھ تھیں اور خاموش تھیں۔ اچانک ان کے اندر کی خاتون بروسلی جاگ اُٹھی۔ انہوں نے تھری وہیلر والے کو جم کر پٹائی ہی نہیں کی بلکہ اس کی گاڑی کا ٹائر اکھاڑ کر تھری وہیلر کو ٹو وہیلر بنا دیا۔ جان اور مال بچانے کے لیے آٹو والا ان دو پہیوں پہ ہی گاڑی بھگا لے گیا۔ ہم آج بھی غور کر رہے ہیں کہ دو پہیوں پر گاڑی چلی کیسے؟

کیا بتائیں آپ کو ہم کیا کیا ظلم سہہ رہے ہیں۔ جب بھی ہماری بیگم کو باکسنگ کی مشق کرنا ہوتی ہے تو وہ ہمیں دو پلے باندھ کر چوکھٹ سے لٹکا دیتی ہے اور ہماری دھنائی شروع کر دیتی ہے۔ اس طرح کشتی کی مشق در مشق جوڈو بھی ہمیں بنایا جاتا ہے۔ ہم بھی بیگم کے ہاتھوں چت پٹ کر ڈھیٹ ہو گئے ہیں۔ کیونکہ زندگی انہیں کے ساتھ گزارنی ہے تو ان کے ستم بھی سہہ رہے ہیں۔ سچ کہتے ہیں کہ ہم سا مظلوم شوہر آپ کو نہیں ملے گا۔

کاش! ہم نے اسپورٹس گرل کو اپنا آئیڈیل نہ بنایا ہوتا اور ایسی کھلنڈری سے شادی نہ کی ہوتی۔ اب تو ہمیں کھیل کے نام سے نفرت ہو گئی ہے۔


لاہور میں مقیم حمد اور نعت کے نامور شاعر

عبدالمجید چٹھہ کے

حمد اور نعت کے مجموعے

اعتراف (حمدیہ)

مہکتا مدینہ (نعتیہ)

مکمل اہتمام کے ساتھ شائع ہو گئے ہیں

ناشر

نستعلیق مطبوعات

الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور

0300-4489310 / 0423-7351963

برطانیہ میں مقیم ممتاز شاعر

کالم نویس اور محقق

احسان شاہد کا چوتھا شعری مجموعہ

تیرا ساتھ رہتا ہے

مکمل اہتمام کے ساتھ شائع ہو گیا ہے

ناشر

نستعلیق مطبوعات

الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور

0300-4489310 / 0423-7351963

افسانہ

# انکار

احسان فیصل کنجاہی

فرخ جس لڑکی سے پیار کرتا تھا وہ ماشاء اللہ بہت ہی خوبصورت تھی۔ صحت مند جسم، ذہین اور بہت زیادہ پڑھی لکھی بھی تھی۔ اس کی سمجھداری اس بات کی گواہی دیتی تھی کہ اس کا گھرانہ بھی بہت اچھا ہے۔ فرخ کے ساتھ کافی عرصہ دوستی میں گزر گیا تو ایک دن فرخ نے مائرہ سے پوچھا کہ میں تم سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ تو مائرہ نے کہا آپ جو سوال کریں گے میں اس کا جواب دوں گی۔ فرخ بولا اگر کوئی شخص تمہاری خاطر اپنا سب کچھ قربان کرنے کا جذبہ رکھتا ہو تمہیں اپنی ہر سانس کے ساتھ یاد کرتا ہو، ہر روز کھانا تمہاری جانب منہ کر کے کھاتا ہو اور تمہیں اپنا محبوب جانتا ہو تو تمہارا اس شخص کے بارے میں کیا خیال ہوگا۔ یہ سب باتیں سن کر مائرہ نے کہا یہ کوئی فلمی ڈائیلاگ ہیں یا کسی افسانے کے فقرات ہیں۔ اس دور میں ایسا کون شخص ہو سکتا ہے جو کسی دوسرے کے لیے جان قربان کرنے کا جذبہ رکھتا ہو۔

فرخ بولا ابھی دنیا میں بڑے عاشق اور دیوانے ہیں۔ مائرہ نے کہا اچھا بتاؤ وہ کون میرا عاشق اور دیوانہ ہے تو فرخ نے کہا ایک شخص پہ بتاؤں گا۔ پہلے وعدہ کرو کہ تم مجھ سے ناراض نہیں ہوگی اور دوستی ختم نہیں کرو گی۔ تو مائرہ نے کہا کہ میں وعدہ کرتی ہوں۔ تو فرخ نے کہا وہ شخص جو تمہارا عاشق اور دیوانہ ہے اور تم کو اپنا محبوب سمجھتا ہے وہ میں ہوں۔ یہ بات سن کر مائرہ کہنے لگی کیا یہ سچ ہے؟ مجھے یقین نہیں آ رہا تو فرخ نے اللہ کی قسم اُٹھائی۔ مائرہ خاموش ہوگئی اور باتوں میں لگ گئی اور فرخ کو کہنے لگی تمہارا بہت شکریہ کہ تم مجھ کو پسند کرتے ہو۔ میں تو اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتی اور نہ مجھ میں وہ خوبیاں ہیں جو تم سمجھتے ہو۔ فرخ نے کہا تم میری نگاہ سے دیکھو گی تو تمہیں نظر آئیں گی۔ البتہ فرخ بہت خوش تھا کہ میں نے اپنی دلربا کو اپنے دلی جذبات سے آگاہ کر دیا ہے اور مائرہ نے بھی غصہ نہیں کیا۔ کچھ عرصہ تک فرخ اور مائرہ حسب روایت آپس میں ملتے رہے۔ شادی وغیرہ کی تقریبات میں اکثر میل ہو جاتا تھا یا پھر کسی گھریلو تقریب میں ملنے کا موقع ملتا۔ مائرہ فرخ کو اب اُس نگاہ سے دیکھتی تھی جیسے محبوب اپنے عاشق کو دیکھتا ہے۔ وقت گزرتا رہا۔ ایک دن فرخ کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ مائرہ سے ایک چیز مانگنی ہے کیسے مانگی جائے۔ چلو وہ ایک اچھی دوست ہے اور اس کو معلوم بھی ہے کہ فرخ اُسے کس قدر چاہتا ہے جب اُس سے ملاقات ہوگی تو مانگ لوں گا۔

چنانچہ جب ملاقات ہوئی تو فرخ نے ڈرتے ڈرتے مائرہ کو کہا کہ زندگی میں تم سے پہلے ایک سوال کیا تھا اور اب تم سے ایک چیز مانگنی ہے تو مائرہ بغیر سوچے سمجھے اور فوراً بولی مانگو میں دینے کو تیار ہوں۔ فرخ نے کہا سوچ لو وہ چیز صرف تمہارے پاس ہے اور تم نے بھی اسے خرید کر نہیں دیکھی اور نہ وہ چیز بنائی جاتی ہے۔ یہ سن کر مائرہ ذرا پریشان ہوئی۔ بالآخر وہ کون سی چیز ہے جو میرے پاس ہے اور وہ خریدی بھی نہیں جاتی۔ مائرہ نے کہا تمہاری چیز ہوگی۔ دوں گی تم مانگو پھر فرخ نے کہا کہ تمہارا خوبصورت سا جسم ہے اور اس جسم کے اندر بہت سارے قیمتی اعضا ہیں جن میں بہت ہی قیمتی اعضاء دل ہے اور اس دل کے اندر ایک محبت ہے۔ میں وہ محبت مانگنا چاہتا ہوں۔ یہ بات سن کر مائرہ بہت ہنسی اور پریشان بھی ہوئی اور کہنے لگی میں آپ کے سوال کا جواب کل دوں گی۔ یہ بات سن کر فرخ تھوڑا پریشان ہوا کہ مائرہ مجھ سے ناراض تو نہیں ہوگی۔ چلو کل تک دیکھتے ہیں۔ فرخ نے بڑی مشکل سے آنے والے کل کا انتظار کیا اور کل آنے پر فون کیا اور مائرہ کو سلام کرنے کے بعد کہا میرے سوال کا جواب دو پھر کوئی اور بات کریں گے۔ جس پر مائرہ نے کہا کہ میں ساری رات سوچتی رہی ہوں کہ اس سوال کا جواب کیا دوں۔ مجھے تو خود سمجھ نہیں آ رہی کہ محبت کیسے دی جاتی ہے۔ چلو فرخ چھوڑیں کیا یہ کوئی ضروری سوال ہے اور کوئی بات کرو مگر فرخ بضد تھا کہ آج تم مجھے ہاں میں یا نہ میں جواب دو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میرا مرنا جینا آپ کے ساتھ ہوگا۔ میں تم سے ناراض نہیں ہوں گا۔ آپ میرے محبوب ہیں تو ہنس کر مائرہ بولی کہ پھر تم انکار سمجھو۔

افسانہ

# بیچارہ

تنویر صادق

میری اور اس کی پہلی ملاقات ایک ریسورنٹ میں ہوئی۔ میں دوستوں کے ساتھ کھانا کھانے گیا ہوا تھا۔ وہ آرڈر لینے آیا اور مجھے دیکھ کر بڑی گرم جوشی سے ملا۔ میں اسے نہیں جانتا تھا وہ عمر میں مجھ سے بہت چھوٹا تھا۔ لہجے سے کوئی زیادہ پڑھا لکھا نہیں لگتا تھا اس لیے میرا اسٹوڈنٹ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ سو میں نے کچھ عجیب انداز سے اسے دیکھا۔ اسے فوراً اندازہ ہو گیا کہ میں جاننا چاہتا ہوں کہ بھائی اس بے تکلفی سے مل رہے ہو پہلے بتاؤ تو سہی کہ تم کون ہو۔ فوراً بولا

سر میں آپ کو جانتا ہوں۔ آپ کو کالج میں اپنے ایک دوست کے ساتھ ملا تھا۔ وہ آپ کا سٹوڈنٹ ہے۔ فلاں لڑکا آپ کو یاد ہوگا اس نے میرے ایک پرانے شاگرد کا نام لیا اور کہا وہ میرے علاقہ کا تھا اور مجھے اس نے اپنے کالج میں سب سے ملایا تھا۔ آپ سے بھی۔ میرا بچپن کا دوست تھا نا۔

اس تعارف کے بعد وہ تمام وقت میرے دائیں بائیں تھا۔ میرے ایک ایک لقمے پر اس نے کھانے کا ذائقہ، کھانے کا معیار اور پتہ نہیں کیا کیا پوچھا۔ ہم کھانا کھا کر باہر نکلے تو بھی وہ ساتھ ساتھ تھا۔ میرے گھر کا پتہ، میرے مشاغل میرے گھر آنے کی مجھ سے اجازت بھی لی اور بہت سی باتیں پوچھیں۔ اتنے میں ریسٹورنٹ کے اندر سے آواز آئی ''آ کر آرڈر لو۔''

وہ مسکرا کر بولا ''بہت مشکل ہے میرے بغیر کوئی کام چلتا ہی نہیں۔ ایک منٹ بھی کسی کا گزارہ نہیں ہوتا۔ اجازت چاہتا ہوں۔ جلد حاضر ہوں گا۔''

یہ کہہ کر وہ واپسی کے لیے مڑا۔ میں طلبا کا عادی ہوں۔ وہ ایک ایک چیز کو دس دفعہ بھی پوچھیں تو بھی مجھے بوجھ نہیں لگتا۔ مگر میرے ساتھی دوست جو میرے ساتھ ریسٹورنٹ میں موجود تھے جو اس بات کے عادی نہ تھے اس کے رویے اور میرے اسے منع نہ کرنے کی وجہ سے کچھ نالاں تھے۔ مگر وہ جانے کو تیار ہی نہ تھا۔ یہ تو مجبوراً جانے والی بات تھی کہ اندر سے بلا لیا گیا مگر جاتے جاتے وہ کہتا ہو گیا۔ جناب دوبارہ ضرور آئیں۔ مجھے خدمت کا موقع ملے گا۔ بس یہ ریسٹورنٹ میرا ہی سمجھیں۔ پھر آہستہ سے بولا ''سر ایماندار آدمی آج کل کہاں ملتا ہے۔ اس ریسٹورنٹ کا مالک میرا عزیز ہے۔ بڑی مشکل سے منتیں کر کے مجھے لایا ہے۔ میں بڑے معقول پیسے لیتا تھا اور بڑی اچھی پوزیشن پر تھا۔ مگر کہتا ہے کہ تنخواہ کی پرواہ نہ کرو۔ زیادہ دوں گا بس سب کام سنبھال لو۔ بس اب اس ریسٹورنٹ کی ساری ذمہ داری مجھ پر ہے۔'' اس کی جانے کی مرضی تو نہ تھی مگر ریسٹورنٹ سے بلانے والوں کی آوازیں کچھ زوردار ہونے کی وجہ سے تیزی سے بھاگتا ہوا واپس چلا گیا۔

اگلے دن وہ سہ پہر کے وقت میرے گھر پر موجود تھا۔ سب سے پہلے اس نے مجھے دوستوں کے ہمراہ اپنے ریسٹورنٹ میں کھانے کی دعوت دی۔ انداز کچھ ایسا تھا جیسے مفت کھانا کھلانے کی دعوت ہو۔ پہلے دن والی باتیں پھر دہرائیں کہ ریسٹورنٹ بس اسی کی وجہ سے چلتا ہو۔ سارا دن ریسٹورنٹ میں گزارتا ہے۔ دونوں وقت کھانا بھی وہیں کھاتا ہے۔ بڑی موج ہے۔ پھر اپنا تفصیلی تعارف کرایا۔ کسی گاؤں کا رہنے والا ہے۔ مگر اب لاہور میں اپنا شاندار مکان ہے۔ بیوی اور دو بچے ہیں۔ بڑی خوشگوار زندگی ہے۔ بے نقط کافی دیر بولنے کے بعد اس نے میرا انٹرویو شروع کیا۔

یہ گھر آپ کا ذاتی ہے؟

گھر میں کون کون رہتا ہے؟

وہ بھی کیا کرتے ہیں اور کیوں کرتے ہیں؟

کرتے کا جواب تو میں نے دیا مگر کیوں کا جواب میرے پاس نہ تھا۔ مگر مجھے اچھا لگا کیونکہ وہ ایک نئی سوچ دے رہا تھا اور میں عام طور پر یہ کہتا ہوں کہ جب آپ کسی چیز کو دیکھ کر سوچنے لگیں کہ یہ کیا ہے، کیوں ہے اور کیسے ہے تو آپ صاحب علم ہیں اور ایک صاحب علم کو سامنے پا کر میں محظوظ ہو رہا تھا۔

دو گھنٹے کی بے معنی باتوں کے بعد اس نے مہربانی کی جو رخصت ہونے کا سوچا۔ کھڑا ہوا۔ جیب سے ایک کاغذ نکالا اور مجھے دیتے ہوئے کہا سر کوئی اچھی سی سرکاری نوکری تو ڈھونڈ دیں۔ مجھے آپ سے بہت اُمید ہے اسی لیے آیا ہوں۔ اُمید ہے آپ مایوس نہیں کریں گے۔ تنخواہ کم بھی ہو تو بھی کوئی بات نہیں۔ نوکری سرکاری ہونی چاہیے۔

میں بوڑھا آدمی ہوں۔ گھر سے نکلتا صرف پڑھانے کے لیے ہوں۔ لوگوں سے بہت کم ملتا ہوں۔ نوکری ڈھونڈنا میرے بس میں نہیں۔ پھر تم اچھی بھلی نوکری کر رہے ہو۔ تمھیں کیا ضرورت ہے؟

میرا یہ جواب سننے کے باوجود وہ بضد تھا کہ وہ جانتا ہے نوکری لے کر دینا میرے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ سرکاری محکموں میں تنخواہ بہت کم ہوتی ہے مگر اس کے خیال میں وہاں کام بھی کوئی نہیں ہوتا اور سرکاری ملازمت کے باوجود وہ موجودہ ملازمت برقرار رکھ سکتا ہے۔ جاتے جاتے اس نے اپنے گھر کا پتہ بتایا اور گھر آنے کی دعوت بھی دے دی۔

وہ چلا گیا تو میں سوچنے لگا کہ سرکاری ملازمتوں کے بارے لوگوں کے خیالات سرکاری اداروں کی

بربادی کا باعث ہیں۔ سرکار کے ملازم کہیں اور ملازمت کرنا کوئی عیب نہیں سمجھتے اس لیے کہ سرکار بھی برا نہیں مناتی۔ میں نے اسی کا دیا ہوا کاغذ نکالا۔ عام سی درخواست نہ تو تعلیم اور نہ ہی تجربے کا کوئی حوالہ۔ بس یہی لکھا تھا کہ مخلص نوجوان ہوں ملازمت دی جائے۔ کہاں اور کیسی اس کے بارے میں کچھ درج نہیں تھا۔

نوجوان چونکہ دو گھنٹے میرے پاس بیٹھ کر گیا تھا اس لیے عمر کو ملحوظ رکھے بغیر آج سے وہ میرا بے تکلف دوست تھا۔ ہر دوسرے دن اس کا فون آتا۔ کبھی کبھار اپنی درخواست کے بارے میں بھی پوچھتا مگر زیادہ تر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اپنے گھر آنے کی دعوت دیتا۔ "جناب غریب خانے پر کب آ رہے ہیں؟ میں اور میرے بچے آپ کے منتظر ہیں۔" میں ہر دفعہ اچھا کہتا مگر کچھ وقت نہ ہونے کے سبب اور کچھ گھر سے نہ نکلنے کی عادت کے سبب اس کی دعوت پر فقط ہنس دیتا اور اچھا کہہ کر ٹرخا دیتا۔ ویسے بھی کسی انجان شخص کے گھر جانا بڑا عجیب تھا۔

ایک دن میں اپنے کسی عزیز کے ہاں بیٹھا تھا کہ اس نوجوان کا فون آیا "سر میں آپ کی گاڑی کے پاس کھڑا ہوں۔ میری خوش قسمتی آپ میرے گھر کے قریب ہی آئے ہوئے ہیں۔ میں نے آپ کے لیے آم ٹھنڈے کیے ہیں آپ میرے گھر آ کر آم کھائے بغیر نہیں جا سکتے۔ آپ جب بھی باہر آئیں گے میں گاڑی کے پاس آپ کو انتظار کرتا ملوں گا۔"

مجھے ابھی دیر لگے گی۔ مجھے تمہارا ایڈریس پتہ ہے میں آ جاؤں گا۔ سر تین چار مکان چھوڑ کر ایک چوڑی سی گلی ہے۔ گلی نمبرے باہر موڑ پر موٹا سا لکھا ہوا ہے۔ اسی گلی میں سامنے جہاں گلی بند ہوتی ہے ایک دو منزلہ خوبصورت مکان ہے، مکان نمبر ۵ یہی میرا ایڈریس ہے۔

میں نے وعدہ کیا کہ کچھ دیر بعد اس کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ چونکہ وعدہ کر لیا تھا اس لیے جب فارغ ہوا تو سوچا چلوں آم پارٹی سے لطف اندوز ہولوں۔

واقعی تین چار مکانوں کے بعد گلی نمبرے کا بورڈ تھا۔ میں نے گاڑی گلی میں موڑی۔ کافی چوڑی گلی تھی، بہت آگے تک جاتی تھی اور سامنے بند ہو رہی تھی اور وہیں بند جگہ پر ایک خوبصورت دو منزلہ مکان تھا۔ مکان نمبر ۵۔ تو نوجوان یہاں رہتا ہے۔ میں گاڑی سے اُترا اور گھر کی گھنٹی کا بٹن دبایا۔ دو منٹ بعد ایک خاتون نے دروازہ کھولا۔ میں نے نوجوان کا پوچھا۔ یکا یک اس کے چہرے پر خفگی کے آثار نمایاں ہوئے۔ اس نے گھور کر مجھے دیکھا۔ پھر میری گاڑی کو دیکھا۔ کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔ دروازہ بند کیا اور واپس چلی گئی۔ کچھ دیر بعد دروازہ دوبارہ کھلا خاتون گویا ہوئی۔ معاف کیجیے گا یہ ہمارا گھر ہے۔ اس (موٹی سی گالی دیتے ہوئے) نے سب کو ہمارے گھر کا پتہ دیا ہوا ہے۔ پیچھے ایک گندی سی آبادی ہے اس میں ہمارے گھر کے بالکل پیچھے والا کمرہ اس نے کرایے پر لیا ہوا ہے اور پتہ ہمارا دیتا ہے۔ بہت دفعہ بے عزتی کی ہے مگر اسے شرم محسوس نہیں ہوتی۔ آپ بزرگ ہیں انکار نہیں کر سکی۔ اسے بتا دیا ہے آتا ہی ہوگا۔ دروازہ پھر بند ہو گیا اور میں نے مسکراتے ہوئے گلی میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ اس نے مکان نمبر ۵ کو اپنا ایڈریس بتایا تھا اپنا گھر نہیں۔ مجھے بات سمجھ میں آ گئی۔

میری گاڑی گھر کے گیٹ سے ہٹ کر ایک دیوار کے ساتھ کھڑی تھی۔ میں غور کر رہا تھا گلی کے آخر میں اس گھر سے پہلے دونوں طرف خالی پلاٹ تھے۔ جن پر لوگوں نے چار دیواری کی ہوئی تھی اور گیٹ لگائے ہوئے تھے۔ اچانک ایک دیوار پر نوجوان نمودار ہوا۔ دیوار پر چڑھا اور پھر دھم سے گلی میں چھلانگ لگائی اور بڑے تپاک سے مجھے ملا۔ اس کا پہلا سوال تھا۔ مکان ڈھونڈنے میں کوئی مشکل تو پیش نہیں آئی؟ پھر اس نے خود ہی جواب دیا "آ ہی نہیں سکتی۔ بڑا آسان پتہ ہے۔ چلیں گھر چلتے ہیں۔ معذرت خواہ ہوں تھوڑا پیدل چلنا پڑے گا۔" وہ تیز تیز گلی میں واپس چلنے لگا۔ میں بھی اس کے پیچھے تھا۔ اس مکان کے دو حصے ہیں۔ میرے پاس پیسے کچھ کم تھے اس لیے مجبوراً پیچھے والا حصہ خریدا۔ آگے والا گو میرا عزیز ہے مگر ناراض ہے اس کی بیوی بھی کچھ بدتمیز ہے اس لیے ادھر سے گزرنے نہیں دیتا۔ ذرا چکر کاٹ کر جانا پڑتا ہے۔

تھوڑا سا چکر کاٹ کر ہم ایک گہرے گڑھے کے کنارے چل رہے تھے۔ لگتا تھا کہ کسی وقت وہاں کمہار کام کرتے رہے ہوں گے۔ کیونکہ بہت سے ٹوٹے ہوئے برتن اور گملے کافی نیچے مٹی میں دفن نظر آ رہے تھے۔ گڑھے کے کنارے بمشکل دو ڈھائی فٹ کا فاصلہ تھا۔ وہ تیز تیز اور میں ڈر ڈر کر چل رہے تھے۔ میری وجہ سے اسے بار بار رکنا پڑتا۔ ہر بار کہتا چلتے آئیں جی ڈرنے والی کوئی بات نہیں۔ میں کیا جواب دیتا۔ میرے حساب میں تو ساری بات ہی ڈرنے والی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں اس موت کے کنوئیں کے کنارے اس کا گھر آ گیا۔ دروازے پر پھٹے پرانے کپڑوں سے بنا پردہ تھا۔ پردہ ہٹا کر ہم اندر داخل ہوئے۔ کوئی 10×10 فٹ کا کمرہ اور اس سے آگے 10×8 جگہ جس میں ایک چھوٹا سا غسل خانہ، ایک چھوٹا سا اوپن کچن اور بقیہ جو کچھ تھا اسے بہر حال صحن کہہ لیں۔ کمرے میں دو چار پائیوں کے درمیان پڑی اکلوتی کرسی پر میں بیٹھ گیا۔ میرے آگے میز رکھ دی گئی۔ میں نے غور کیا مکان نمبر 5 سے اس کا کسی طرح کوئی تعلق نظر نہ آتا تھا۔ تعمیر اس قدر گندی اور ناقص تھی کہ کسی قدیم کھنڈر کا حصہ لگتا تھا۔ شاید اس کے مطابق یہ شاندار مکان تھا۔ مجھے یاد آیا گھر انسانوں سے بنتے ہیں اینٹوں سے نہیں۔ پہلے میرا تعارف بچوں سے کرایا گیا۔ ایک شاید دوسری میں اور دوسری چوتھی میں پڑھتے تھے۔ پھر اس نے اپنی بیگم سے ملایا۔ یہ ایک سکول میں ہیں مسٹریس ہیں۔ اچانک اسے یاد آیا اس نے مجھے آم کھلانے تھے۔ کہنے لگا ٹھنڈا آم کھانے کا مزا بھی خوب ہے۔ میں ابھی لے کر آتا ہوں۔ بیگم کو اشارہ کیا۔ پلیٹ اور چھری تیار رکھو اور وہ باہر نکل گیا۔ مجھے انداز ہو گیا کہ آم کی قربانی کا خصوصی

اہتمام ہونے لگا ہے۔ وہ باہر نکلا تو اس کی بیگم نے چھری اور پلیٹ میرے سامنے سجا کر رکھ دی۔ میں نے اس کی بیگم سے پوچھا کون سے سکول کی ہیڈ مسٹرس ہیں؟ کچھ شرما کر کہنے لگی یہیں قریب ہی ہے۔ اصل میں سکول کی مالکن خود ہی ہیڈ مسٹریس ہیں۔ مگر آتی بہت کم ہیں اس لیے ہیڈ مسٹریس کے فرائض بھی میں ہی انجام دیتی ہوں۔ پانچ کلاسیں میرے ذمے ہیں۔ پانچ کلاسیں میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ پرائمری سکول ہے اس طرح تو آپ اکیلی ہی ٹیچر ہوں گی۔ جی ہاں۔ مالک اگر آ جائیں تو پھر میں تین کو پڑھاتی ہوں اور وہ دو کو اور اگر نہ آئیں تو پھر ساری کلاسیں ہی میری ذمہ داری ہوتی ہے۔ میں نے پوچھا بچے کتنے ہیں؟ بولی تقریباً 140۔ اتنے بچوں کو اکیلی کنٹرول کیسے کرتی ہیں؟ جواب ملا یہ کون سا مشکل کام ہے؟ ہر کلاس کا ایک مونیٹر ہے جو کلاس کو دیکھتی ہے۔ ہیڈ مسٹرس کا کمرہ درمیان والی جگہ ہے، کسی کلاس سے شور سنائی دے تو جانا پڑتا ہے ورنہ مانیٹر سارا کام کروا لیتی ہے اور کوئی مشکل ہو تو آ کر مجھ سے پوچھ لیتی ہے۔ ویسے چاروں کمرے اردگرد ہونے کی وجہ سے کلاسوں میں پوری نظر رہتی ہے اور کبھی مشکل پیش نہیں آئی۔

میں ابھی اس شاندار نظام تعلیم پر گفتگو کر ہی رہا تھا کہ نوجوان واپس آ گیا۔ بیوی کو آواز دے کر چھری اور پلیٹ سمیت بلایا اور کہا کہ آم کاٹو۔ لڑکی باہر چلی گئی تو نوجوان نے بزرگ عورت کا تعارف کرایا۔ یہ میری ساس ہیں۔ یہ بھی ٹیچر ہیں۔

آپ کس سکول میں پڑھاتی ہیں؟ میں نے سوال کیا۔

اسی سکول میں جہاں میری بیٹی ہے۔ جواب ملا۔

مگر یہ پرائمری سکول ہے اور پانچ کلاسیں تو آپ کی بیٹی پڑھاتی ہے۔ آپ کیا پڑھاتی ہیں؟

بزرگ عورت نے شرماتے ہوئے جواب دیا میں نرسری کلاس کو پڑھاتی ہوں۔

آپ کتنا پڑھی ہیں؟ میرے اس سوال کے جواب میں فرمانے لگیں میں تو پڑھی لکھی نہیں مگر نرسری میں تو کھیل کود کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ ہمارے سکول میں بہت سے کھلونے ہیں۔ صبح کو بکس سے نکال کر بچوں کو دے دیتی ہوں۔ جب وہ کھیل کر تھک جاتے ہیں واپس رکھ لیتی ہوں۔ نوجوان نے باہر سے آواز لگائی۔ سر یہ وہاں کینٹین بھی چلاتی ہیں۔ کلاس اور کینٹین ایک ساتھ۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ بزرگ عورت نے جواب دیا تھوڑی سی چیزیں ہوتی ہیں کلاس ہی میں ایک طرف رکھ لیتی ہوں مجھے تنخواہ نہیں ملتی۔ کینٹین کی ساری آمدن میری اور اس کے عوض نرسری کو پڑھانا میری ذمہ داری۔ واہ واہ۔ ایک پنتھ کئی کاج۔ ساری قوم اگر ایسے ہی کام کرنے لگے تو بیڑہ بہت جلد پار ہو سکتا ہے۔

اتنے میں نوجوان پلیٹ میں کٹا ہوا آم سجائے میرے پاس تھا۔ لگتا تھا پورا ایک آم میرے اعزاز میں ذبح کیا گیا ہے۔ پتلے پتلے ٹکڑوں سے بھری ہوئی پلیٹ اور درمیان میں گٹھلی بڑی خوبصورتی سے رکھی ہوئی تھی۔ پہلے ٹکڑے کے بعد میں نے دوسرے ٹکڑے کو ہاتھ لگایا ہی تھا کہ نوجوان نے تمام گھر والوں کو حکم دیا ''آپ بھی لے لو'' ساس، بیوی اور دونوں بچے جو شاید اسی انتظار میں تھے تیزی سے جھپٹے۔ اب پلیٹ میں سوائے گٹھلی کے کچھ نہیں تھا۔ نوجوان نے مسکراتے ہوئے گٹھلی اُٹھائی اور کہا ''گٹھلی کھانے کا اپنا ہی مزا ہے۔'' میں نے سر ہلایا۔

ہاتھ دھوئیں گے؟ سوال ہوا۔

ضرور..... ضرور۔ میں نے جواب دیا۔

برتن میں پانی ڈال کر پہلے سے تولیہ ساتھ سجا کر باہر رکھا تھا۔ میں نے ہاتھ دھوئے اور اجازت چاہی۔ نوجوان شاید یہی چاہتا تھا فوراً اُٹھا اور مجھے گاڑی تک چھوڑنے آیا۔ کسی اور دن گھر پر کھانے کی دعوت دی۔ میں نے ہنس کر اچھا کہا۔ گاڑی میں بیٹھا مکان نمبر 5 پر نظر ڈالی۔ جو نوجوان کا ایڈریس تھا۔ واقعی فقط ایڈریس تھا اور واپس آ گیا۔ بہت عرصے تک نوجوان کا نہ تو فون آیا اور نہ ہی اس سے ملاقات ہوئی۔ کچھ عرصہ پہلے اپنے ایک دوست کے دفتر میں گیا تو وہ بحیثیت چپڑاسی وہاں کام کر رہا تھا۔ چہرے پر پہلی سی رونق نہ تھی۔ کچھ اداس اداس تھا۔ مجھے خوشی خوشی میرے دوست کے کمرے میں لے گیا اور بتایا کہ صاحب آنے والے ہیں۔ اس دفعہ وہ چپ چپ تھا۔ بس اتنا کہ صاحب آپ کے دوست ہیں؟ میں نے ہاں کہا۔ مگر وہ کچھ گم سم تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس سے کچھ احوال پوچھوں مگر میرا دوست اندر آ گیا اور آتے ہی اس سے بولا ''تم یہاں کھڑے ہو۔ کئی بار تم سے کہا ہے کہ مہمان کو بٹھا کر فوراً کمرے سے دفع ہو جایا کرو۔'' بیچارہ سر جھکائے چپ چاپ باہر نکل گیا اور میرے دوست کہنے لگے ''بہت احمق ہے میں نہ ہوں تو میری کرسی پر بیٹھ جاتا ہے اور لوگوں کو کہتا ہے بس میں ہی مالک ہوں۔ میرا نام لے کر کہتا ہے کہ دوست ہے بس سرمایہ کاری تھوڑی سی زیادہ ہے اس لیے رعب جماتا ہے۔ میں چھوڑ کر اس لیے نہیں جاتا کہ میرے بغیر تو سارا کاروبار ڈوب جائے گا۔ مجھے اس کی ایسی فضول باتوں پر غصہ آتا ہے۔ جھڑکتا بھی ہوں مگر اسے اثر نہیں ہوتا۔ غریب آدمی ہے۔ گھر میں کھانے کو کچھ نہیں۔ بچوں کا برا حال ہے۔ بیوی میرے گھر میں کام کرتی ہے۔ نکالتے ہوئے خدا کا خوف محسوس ہوتا ہے مگر اسے ایسی باتیں کرتے شرم نہیں آتی۔ بس مہمانوں سے کم از کم ملنے دیتا ہوں۔ میں نے دوست کی بات سنی اور فقط مسکرایا۔ شاندار مکان نمبر 5 کے ایڈریس والا بیچارہ نوجوان واقعی اب کسمپرسی اور بیچارگی کی حالت میں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میرے جانے کے بعد وہ میرے دوست کو اپنے اور میرے پرانے تعلقات کا بتائے گا اور وہی ہوا۔ تھوڑی دیر میں گاڑی چلاتے گھر جا رہا تھا کہ میرے دوست کا فون آ گیا۔ یار تم نے بتایا ہی نہیں کہ تمہاری اس سے بہت پرانی دوستی ہے۔ میں ہنسا مگر چپ رہا۔ خود نمائی کی عادت نے اسے بہت رسوا کیا تھا مگر وہ عادت سے مجبور تھا بیچارہ۔

## مختار جاوید/لاہور

اک عمر سے سفر میں سفر کے بغیر ہوں
میں اُس مقام پر ہوں جہاں رہ گزر نہیں

---

دُعا قبول کسی بددُعا کے ساتھ ہوئی
ملے جو پھول تو خوشبو ہوا کے ساتھ ہوئی
گئے وہ زخم جنہیں مندمل نہ ہونا تھا
یہ انتہائی ستم ابتدا کے ساتھ ہوئی
درِ قفس پہ پروں سے اُڑان غائب تھی
ہوئے رہا تو رہائی سزا کے ساتھ ہوئی
دُعا کے وقت خوشی نے وہ سماں باندھا
لگا کہ بات ہماری خدا کے ساتھ ہوئی
سنبھل کے بار ہزیمت اُٹھا لیا ہم نے
شکست بوجھ تھی لیکن اَنا کے ساتھ ہوئی
اُس اجنبی سے ہوئی جنبشِ زباں کے بغیر
وہ بات جو نہ کسی آشنا کے ساتھ ہوئی
دوا کے بعد دُعا سے علاج درد کیا
طلب نجات کی پوری قضا کے ساتھ ہوئی
مُخل ہوئی تو ترا انتظار باقی تھا
بلا کی آنکھ مچولی قضا کے ساتھ ہوئی
بہت جنون تھا صحرا کی آبیاری کا
مگر نہ موج کنارے تک آ کے ساتھ ہوئی

---

اک دیے سے دوسرا جلتا رہے
روشنی کا سلسلہ چلتا رہے
کھو نہ جائیں چاند سورج کی طرح
اِک اُبھرتا دوسرا ڈھلتا رہے
کاٹتا رہتا ہوں شاخیں پیڑ کی
چاہتا ہوں پھولتا پھلتا رہے
جو خجالت ہو گئی سو ہو گئی
ہاتھ کوئی عمر بھر ملتا رہے
موت عُجلت میں نہ آ جائے کہیں
ہو نہ ہو یہ مرحلہ ٹلتا رہے
میری مجبوری میں ہر موقع پرست
مونگ چھاتی پر مری دلتا رہے
دل ڈسے بھی تو بروئے مصلحت
سانپ زیرِ آستیں پلتا رہے

---

جانے کو رہ گزر نہیں رہنے کو گھر نہیں
رُکنا پڑاؤ پر بھی ہمیں عمر بھر نہیں
دیکھے ہیں میں نے شہر میں ہر شیخ کے محل
چھت ہے اگر کسی کی تو دیوار و در نہیں
ہم لوگ اپنی موت سے پہلے ہی مر گئے
ہم سے ہی انتظار ہوا عمر بھر نہیں
اس تیرگی کے سلسلے ہیں لاشعور تک
خوابوں میں کوئی خواب بھی خوابِ سحر نہیں
ہم آ گئے ہیں دشت میں اس اعتبار پر
ہونا پڑے گا اب تو کہیں دربدر نہیں
ہم سے مطالبات زر و مال کس لیے
یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہم اہلِ زر نہیں
اک عمر سے سفر میں سفر کے بغیر ہوں
میں اُس مقام پر ہوں جہاں رہ گزر نہیں
سر چاہیے جسے اُسے دستار کون دے
دستار مانگتا ہے وہی جس کا سر نہیں
وہ پر لگا کہ جاؤں فلک پر رُکے بغیر
میں جانتا ہوں راہ میں کوئی شجر نہیں

---

گونج تھی کل بھی اس فسانے کی
یہ کہانی ہے ہر زمانے کی
جس کو لُوٹا ہے پوری فرصت سے
ہم ہی پونجی تھے اس خزانے کی
ہر مسافت ہے پاؤں کے نیچے
دیر ہے بس قدم اُٹھانے کی
ڈھیل دی جس نے اس کی حکمت تھی
اس رعایت سے آزمانے کی
تیر ہے تُو تو اے مرے دشمن
میں خطا ہوں ترے نشانے کی
اُن کو بھی قبر میں سکون ملا
جن کو حسرت رہی ٹھکانے کی
عمر بھر سفر تھا پاؤں میں
زیست مہلت تھی آنے جانے کی
کوئی دہلیز تک نہیں آیا
ہائے قسمت غریب خانے کی
بات کیا تھی کوئی معمہ تھا
اُس کے آنے کی، میرے جانے کی

---

شروع سے ہے اُسے کد مرے کلام کے ساتھ
اُلجھ رہی ہے مری ذات میرے نام کے ساتھ

# اقتدار جاوید/لاہور

## غار

ہے ممکنات میں کہ دونوں
ایک شہر میں مقیم ہوں
فلک کے لاجوردی تھال کو
سیاہ دن کی دُھول نے
ذرا سی شام کی غریب روشنی نے
شب کی نرم راکھ نے چھپا لیا ہو
لاجوردی تھال کو ستاروں کے سمیت
کھا لیا ہو
اور اسیر ایک ہی
فلک کے نیچے چل رہے ہوں
اپنی اپنی زندگی کی آگ کی
انگیٹھیوں میں جل رہے ہوں

گاڑیوں کے اژدحام میں
رُکے ہوئے ہوں اک جگہ پہ
انتظار میں کہ سبز روشنی ہو
چل پڑیں، نکل پڑیں
سڑک کی بھیڑ میں
رواں دواں ہوں
ساتھ ساتھ جا رہے ہوں
آئنے میں دفعتاً تیری جھلک پڑے
نگاہ یک بیک چھلک پڑے
ہم ایک پیڑ کا لذیذ پھل
خریدتے ہوں ایک ہی دکان سے
وہ پھل کسی کے واسطے
تو کاش کاش جاں فروز ہو
کسی کے واسطے
وہ کاش کاش زہر ہو!
سیاہ شب میں
دونوں نیند کے جہاں میں
دونوں عین مین
اک سفید شکل دیکھتے ہوں
موتیے کے پھول کھل اُٹھے ہوں
دو گھروں کے سامنے

ہے ممکنات میں
کہ دونوں ایک شہر میں مقیم ہیں
ہم ایک راستے سے
شہر کی حدود چھوڑتے ہوں
سات دن کہیں گزارتے ہوئے
ہم ہوں، خود کو جوڑتے ہوں
یا دوبارہ ایک راستے سے دونوں

## کشف

مصلا اُٹھایا ہے
سانسوں کو باہر نکالا ہے
گھر والی کو
ایک پیغام بھیجا ہے
اور
دوستوں کو بتایا ہے
یہ میرا ٹیگ ہے
اسی ٹیگ میں
خود میں اُٹھاؤں گا محشر
میں خود ان کو دیکھوں گا
خود ان کے کاندھے اُتاروں گا
مکار فرقے کے ہاتھوں
اسی شہر میں
پھول والی گلی میں
وہ نظموں کی قرأت کے دوران
مارا گیا تھا
یہاں
خاک کے بھیس میں
اک ستارہ اُتارا گیا تھا
وہیں ان کو لاؤں گا
چن چن کے ماروں گا
بالوں سے پکڑوں گا
حنظل کے میداں میں کھینچوں گا
بازار سے تھان
گہرے سیہ رنگ کا تھان
منگوانا ہے
ایک ہی قبر میں
سب کو دفنانا ہے
اس سیہ رنگ کے تھان میں
ان کو کفنانا ہے

اس ریاضت کے دوران
جو کشف کا عرصہ گزرا
بھلانے کی آخر گھڑی آ گئی ہے
مگر کشف
جو مجھ پہ اب ہو گیا ہے
بتانے کی
آخر گھڑی آ گئی ہے!!

# پروفیسر احمد ساقی /اوکاڑا

میری زندگی تو یوں کھڑے کھڑے ہی کٹ گئی
بیٹھنے دیا گیا نہ راستہ دیا گیا

میرے ہونے کا مجھے پہلے یقیں ہونے دے
پھر عدم کا تو مجھے تخت نشیں ہونے دے
ورنہ یہ بات عبادت کی رہے گی تشنہ
پہلے تسلیم کے قابل یہ جبیں ہونے دے
تو مجھے جلوہ دکھا اپنا مرے سامنے آ
حشر موسیٰ کی طرح بعد ازیں ہونے دے
میں تری ذات کا حصہ تو نہیں ہوں پھر بھی
مرے مولا تو مجھے عرش نشیں ہونے دے
تیرا اثبات مکمل تبھی ہوگا مجھ میں
پہلے اندر تو مرے ایک ''نہیں'' ہونے دے
خلق اب ساری تری داد رسی کو ترسے
کل جو کرنا ہے تجھے آج یہیں ہونے دے

میری خاک کو جب آئنہ بنا دیا گیا
عکس بھر دیے گئے خدا بنا دیا گیا
پہلے میری ذات کو بنا دیا گیا تھا اشک
پھر خدا کی آنکھ سے اسے گرا دیا گیا
میری زندگی تو یوں کھڑے کھڑے ہی کٹ گئی
بیٹھنے دیا گیا نہ راستہ دیا گیا
راستوں کی دُھول تھا تو پوچھتا نہ تھا کوئی
سنگ میل کیا ہوا نشاں مٹا دیا گیا
ایک بار ہی نہیں سو بار یہ ستم ہوا
زندگی کی آنکھ کو رُلا رُلا دیا گیا
منفعت، منافقت کی محفلیں سجی رہیں
جس نے دل کی بات کی اسے اُٹھا دیا گیا
روشنی نے جب کیا ستمگروں کو بے نقاب
بے حسی کے ہاتھ سے دیا بجھا دیا گیا

یقین خالق کون و مکان رہتا ہے
مگر کہیں کہیں وہم و گمان رہتا ہے
وہ جس مکان میں پہلے مکین رہتا تھا
اسی مکین میں اب وہ مکان رہتا ہے
جناب منصف اعلیٰ! ابھی ذرا رکیے
ابھی قتیل کا اپنا بیان رہتا ہے
میں جب سے خوف کی دیوار پھاند آیا ہوں
مرے وجود میں امن و امان رہتا ہے
مری تلاش مجھے دشت میں اُٹھا لائی
یہیں کہیں پہ مرا خاندان رہتا ہے
یونہی پرندے کسی خوف میں نہیں رہتے
کوئی تو تیر بدست کمان رہتا ہے
یہ جان کر تو تحیر میں مبتلا ہوا میں
کہ ایک ذرّے میں پورا جہان رہتا ہے

میں زمیں سے آ رہا ہوں آسماں سے تو نکل
اے مرے خاکی بدن، اب درمیاں سے تو نکل
کائناتی وسعتوں سے آشنا ہونا ہے گر
پھر مری جاں، زندگی کے سائباں سے تو نکل
کیسا ڈر ہے تیرے اندر جو کھنچا رہتا ہے تو
یا کماں کو توڑ دے یا پھر کماں سے تو نکل
مجھ پہ گر احسان کرتا ہے تو یوں احسان کر
چل اُٹھا کردار اپنا داستاں سے تو نکل
گر تعلق کو نبھانا بوجھ ہے تیرے لیے
لا، اسے میں توڑتا ہوں امتحاں سے تو نکل
روشنی میں دب گئی ہے تیری اپنی ذات بھی
اے مرے ننھے ستارے کہکشاں سے تو نکل

عدم کا خوف تھا، وہ بھی اُتار بیٹھا ہوں
اب اپنی موت کے سر پر سوار بیٹھا ہوں
شب گماں کا فقط انتظار ہے مجھ کو
میں اپنے حصے کا دن تو گزار بیٹھا ہوں
مرے وجود کا کوئی مشاہدہ تو کرے
میں کیسی گرد میں بن کر غبار بیٹھا ہوں
اب آئنوں سے عداوت نہیں رہی مجھ کو
تحیرات کے صدمے گزار بیٹھا ہوں
کوئی تو آئے مرے پاس تعزیت کرنے
وجود خاک لحد میں اُتار بیٹھا ہوں
بہت تضاد ہے میرا جہان والوں سے
سو اپنی ذات کا بن کر حصار بیٹھا ہوں

روداد مجھ سے دل کی سنائی نہیں گئی
اس واسطے رگوں سے رہائی نہیں گئی
اک خواب تو اُٹھا لیا میں نے چرا کے آنکھ
تعبیر اس کی مجھ سے اُٹھائی نہیں گئی
گو ہجر پورے شہر کی چوکھٹ سے اُٹھ گیا
لیکن مری گلی سے جدائی نہیں گئی
پتھر بنا ہوا تھا میں اپنے وجود میں
دریا سے میری لاش اُٹھائی نہیں گئی

# اطہر شکیل نگینوی/انڈیا

سامنے ان کے جھکا کرتی ہے دُنیا اطہر
رب کے آگے سرِ تسلیم جو خم رکھتے ہیں

یہ تماشہ زمین پر کیوں ہے
خیر کم، بے حساب شر کیوں ہے
کیا دعاؤں نے ساتھ چھوڑ دیا؟
وسوسوں سے بھرا سفر کیوں ہے
رابطہ مجھ سے توڑنے والا
میرے سکھ دکھ سے باخبر کیوں ہے
دیکھتا ہے تو غور سے دیکھو
یہ اچٹتی ہوئی نظر کیوں ہے
شب کو آنگن میں خشک موسم تھا
بھیگی بھیگی سی پھر سحر کیوں ہے
وہ تو سب کو عزیز رکھتا تھا
زد میں شعلوں کی اس کا گھر کیوں ہے
ہم سفر ساتھ ہے مرے پھر بھی
سونی سونی سی رہ گزر کیوں ہے
وہ جو کل تک رئیس تھا اطہر
اس کی اولاد دربدر کیوں ہے

گڈے گڑیوں کی راجہ رانی کی
یاد آتی ہے اس کہانی کی
لاکھ اوروں نے بدزبانی کی
عادتاً میں نے گل فشانی کی
دوستی اُس نے وقتاً کی تھی
بے وفائی بھی ناگہانی کی
ہاتھ سے آئنہ گرا، ٹوٹا
یہ حقیقت ہے زندگانی کی
اس نے جب اپنی موندلیں آنکھیں
ختم میں نے بھی تب کہانی کی
گھر میں رہتے ہیں ہم، مگر یہ بھی
ایک صورت ہے بے مکانی کی
خواہشیں، امتحاں، کشش، کوشش
یوں بسر ہم نے زندگانی کی
دشمنوں کو گلے لگا کے شکیل
ہم نے خود پر ہی مہربانی کی

رنگ محلوں کو تصور کے سجائے رکھنا
دل سے تنہائی کا احساس بھلائے رکھنا
پھول یادوں کے یوں ہی دل میں کھلائے رکھنا
اس کی خوشبو سے ہر اک سانس بسائے رکھنا
اتنا آساں تو نہیں روز کہانی سے تری
اپنی تنہائی کو رنگین بنائے رکھنا
کوئی ہم راز ہے دنیا میں نہ مخلص کوئی
دل کے رشتوں کو زمانے سے چھپائے رکھنا
ہے بڑی چیز مقدر بھی وگرنہ دن رات
چاہتے ہم بھی ہیں تقدیر جگائے رکھنا
لوگ لمحوں میں پرکھ لیتے ہیں سب کچھ اطہر
خود کو دنیا کی نگاہوں سے بچائے رکھنا

غیرتِ قوم کچھ اس طرح جگائی جائے
اپنے اسلاف کی تاریخ بتائی جائے
زورِ حق سے سرِ باطل کو کچلنا ہے اگر
دوستو! پھر کوئی تنظیم بنائی جائے
یہ الگ بات نہ جاگے تری غیرت لیکن
تیرے احساس پہ اک ضرب لگائی جائے
خامشی چیخ میں تبدیل بھی ہو جائے گی
اپنا حق پانے کو آواز اُٹھائی جائے
خود سمجھ جائے گا تو اپنی حقیقت ناداں
تجھ کو پھر تیری ہی تصویر دکھائی جائے
چھوڑ کر قصۂ اسلاف یہ بہتر ہے کہ اب
اپنے کردار سے تاریخ بنائی جائے
اتنے فرقوں میں جو تقسیم کرے ہم کو شکیل
اب کدورت کی وہ دیوار گرائی جائے

احتیاط اپنی بہت اہلِ ستم رکھتے ہیں
ہم سے دیوانے جو بستی میں قدم رکھتے ہیں
اعتماد ان سے ہوا ہے مرا پارہ پارہ
اپنے ہونٹوں پہ جو ہر لمحہ قسم رکھتے ہیں
کوئی رنجش کبھی ظاہر نہیں ہونے والی
ہم بہت اپنے تعلق کا بھرم رکھتے ہیں
ماں کی تصویر نگاہوں میں اُبھر آتی ہے
جب بھی تاخیر سے ہم گھر میں قدم رکھتے ہیں
دھیان رکھنا ہمیں کمزور سمجھنے والو!
بازوؤں میں وہی ہم پہلا سا دم رکھتے ہیں
سامنے ان کے جھکا کرتی ہے دنیا اطہر
رب کے آگے سرِ تسلیم جو خم رکھتے ہیں

# آفتاب احمد/ جھنگ

گلاب جسم کی خوشبو پکارتی تھی مجھے
یہ خواب میں نے کسی شب کے درمیاں دیکھا

دھنک مزاج تھی، زخموں کو پھول کر رہی تھی
وہ سبز آگ جو مجھ میں حلول کر رہی تھی
بہت کیا مرا انکار پھر بھی یہ دُنیا!
بڑے ہی چاؤ سے مجھ کو قبول کر رہی تھی
میں ہنس رہا تھا ستارے سجا کے پلکوں پر
عجب خوشی تھی جو دل کو ملول کر رہی تھی
میں لکھتا جاتا تھا اُس کو غزل کے مصحف میں
بہ شکلِ شعر جو آیت نزول کر رہی تھی
میں سیدھی راہ پہ آیا ہوں لغزشوں کے سبب
ستم یہ مجھ پہ مری کوئی بھول کر رہی تھی
نہ جانے کون سے رستے کی گرد تھی احمد
جو عمر بھر کی مسافت کو دھول کر رہی تھی

یہ اور بات کہ آنکھوں کو نم نہیں کیا ہے
بچھڑنے والے! ترا سوگ کم نہیں کیا ہے
یہ سوچ کر کہ تعاقب میں آ نہ جائے کوئی
تری طرف ابھی پہلا قدم نہیں کیا ہے
سمجھ لوں کیسے وہ میری خوشی میں خوش ہو گا
کہ جس نے میرے غموں کا بھی غم نہیں کیا ہے
میں سب کے ساتھ چلوں اور الگ دکھائی دوں
سو، اپنا راستہ رستوں میں ضم نہیں کیا ہے
مرا خمیر ہی سِکّوں میں ڈھلنے والا نہ تھا
سو خود کو بندۂ دام و درم نہیں کیا ہے
میں آفتاب رکھوں اُس سے کیا اُمیدِ وصال
وہ جس نے ہجر بھی پورا بہم نہیں کیا ہے

اب یوں ترے خیال میں رہنے لگا ہوں میں
فرقت میں بھی، وصال میں رہنے لگا ہوں میں
پھر سے کوئی خوشی ہے مری منتظر کہیں
پھر سے کسی ملال میں رہنے لگا ہوں میں
شاید یہی دلیل ہے میرے عروج کی
اندیشۂ زوال میں رہنے لگا ہوں میں
اِک آئنے کی مجھ پہ عنایت ہے کس قدر
اب اپنے خدوخال میں رہنے لگا ہوں میں
گر ٹوٹنے کا خوف نہیں ہے مجھے تو پھر
کیوں اپنی دیکھ بھال میں رہنے لگا ہوں میں
یا تو ہے ساتھ پاؤں کے چکر بندھا ہوا
یا پھر کسی دھمال میں رہنے لگا ہوں میں
ہوں حرفِ خاص یوں مجھے حاصل دوام ہے
اب عام بول چال میں رہنے لگا ہوں میں
ناسور تو بنا ہی نہیں زخم آفتاب
اور فکرِ اندمال میں رہنے لگا ہوں میں

کس آئینے کی زد تک آ گیا ہوں
میں واپس خال و خد تک آ گیا ہوں
اب آگے ہے مری منزل کہاں پر
ازل سے میں اَبد تک آ گیا ہوں
کیا ہے تو نے جو اثبات میرا
میں ہونے کی سند تک آ گیا ہوں
یہ پھیلاؤ مرا فطری عمل تھا
بکھر کے اپنی حد تک آ گیا ہوں

میں نکلا تھا تلاشِ زندگی میں
تو پھر کیسے لحد تک آ گیا ہوں
پہنچ جاؤں گا اب اہلِ جنوں تک
کہ میں اہلِ خرد تک آ گیا ہوں
ہوا ہی چاہتا ہے خیر مقدم!
میں خطِ مسترد تک آ گیا ہوں
مجھے بھی دار پر کھینچا گیا ہے
میں احمد اصل قد تک آ گیا ہوں

آنکھوں میں بھر گئے ہیں نظارے بجھے ہوئے
لگنے لگے چراغ بھی سارے بجھے ہوئے
روشن کیا چمن کو یہ اندازِ فصلِ گل
شاخوں سے پہلے پھول اُتارے بجھے ہوئے
کشتی کے ڈوبنے کا ہے دونوں کو غم مگر
دریا رواں دواں ہے کنارے بجھے ہوئے
کیا آئنوں کے پاس بجز عکس کچھ نہیں؟
کوئی تو خال و خد بھی سنوارے بجھے ہوئے
سمجھے گا کون کیسے چراغوں کے سوگ میں
نکلے ہیں آج صبح کے تارے بجھے ہوئے
بجھنے پہ ختم ہوتا نہیں کھیل آگ کا
کرتے ہیں راکھ اب تو شرارے بجھے ہوئے
کھلنے کے باوجود بھی آنکھیں نہیں کھلیں
بے منظری ہے یا ہیں اشارے بجھے ہوئے
بوجھل شبِ فراق ہی کب تھی کہ آفتاب
تیرے بغیر دن بھی گزارے بجھے ہوئے

# جاوید آغا/بھلوال

میرے کمرے میں رہی ہیں محو رقصاں ظلمتیں
صحن میں تو قہقہے دو چار تھے دو چار ہیں

جو کہتے ہیں شجر پر ڈالیاں اچھی نہیں لگتیں
حقیقت میں انہیں خوشحالیاں اچھی نہیں لگتیں
تمہیں اوروں کی خاطر اک نمونہ پیش کرنا ہے
مرے بیٹے تمہیں یہ گالیاں اچھی نہیں لگتیں
امیر شہر کہتا پھر رہا ہے ایک بیوہ سے
ترے کانوں میں اب یہ بالیاں اچھی نہیں لگتیں
جو کٹیا میں پلی ہے کوئی اس سے جا کے یہ کہہ دے
کہ چہرے زرد ہوں تو لالیاں اچھی نہیں لگتیں
کسی گوشے میں آخر کچھ بھلائی کا بھی پہلو ہو
ہر اک جانب یہ بداعمالیاں اچھی نہیں لگتیں
تری آنکھوں نے دیکھا جب سے جلتے کھیت کا منظر
اسی دن سے انہیں ہریالیاں اچھی نہیں لگتیں
فقط یہ سوچ کر میں دور اس سے ہو گیا آغا
شریفوں کے گھروں میں نالیاں اچھی نہیں لگتیں

آپ ماہ و سال سے مختار تھے مختار ہیں
لوگ لیکن شہر کے بیزار تھے بیزار ہیں
بیس برسوں کی ریاضت کا ثمر یہ رتجگے
سوچ کے سب زاویے بیکار تھے بیکار ہیں
پاؤں چھلنی ہیں مگر محو سفر ہوں دیکھ لے
تیرے گھر کے راستے دشوار تھے دشوار ہیں
میرے کمرے میں رہی ہیں محو رقصاں ظلمتیں
صحن میں تو قہقہے دو چار تھے دو چار ہیں
کیا ہوا گاؤں میں اک مفلس کی بیٹی مر گئی
پھر بھی بیٹے آپ کے سردار تھے سردار ہیں
بھوک ورثے میں ملی جاوید کیسے ختم ہو
ہم ترپن سال سے نادار تھے نادار ہیں

تھا پیار تجھ سے تو گھر کا طواف کیوں کرتا
یہ راز راز رکھا انکشاف کیوں کرتا
جب اس کی بات کی بنیاد ہی حقیقت تھی
میں اس کی بات سے پھر اختلاف کیوں کرتا
وہ میری جنبش لب پر نثار ہوتا ہے
وہ کہہ رہا تھا تو میں انحراف کیوں کرتا
جب اس نے گھر کی روایت کو توڑنا چاہا
اگرچہ لخت جگر تھا معاف کیوں کرتا
میں جس کے سائے میں پل کر شباب تک پہنچا
میں اس فصیل میں آخر شگاف کیوں کرتا
وہ تیرا پیار تری بے وفائیاں شکوے
حسین داغ تھے دل کے میں صاف کیوں کرتا
جو مصلحت کو میں جاوید سامنے رکھتا
تو فیصلہ میں یہ اپنے خلاف کیوں کرتا

جو کہتا ہے فکر و فن نے ساری شہرت بخشی ہے
سچ تو یہ ہے اس کو دھن نے ساری شہرت بخشی ہے
جس کے آنسو جس کی آہیں شعروں میں ڈھل جاتے ہیں
اس کو اس کے سچے فن نے ساری شہرت بخشی ہے
شہر کا ہر اک باسی تیری ذات کا ہے ممنون بہت
جھنگ کو ہیر ترے مدفن نے ساری شہرت بخشی ہے
شیش محل میں لاش سجا کر راہیں تکتی رہتی ہے
جس کو پائل کی چھن چھن نے ساری شہرت بخشی ہے
گرچہ اس میں شامل تھے بچوں کے بھائی بھی لیکن
سیسے تجھ کو مارو بن نے ساری شہرت بخشی ہے
بے مقصد بن سوچے آغا رات گئے تک پھرا کرو
تجھ کو اس آوارہ پن نے ساری شہرت بخشی ہے

میری ساری رام کہانی پتے زرد اور سوکھے پھول
میرا بچپن اور جوانی پتے زرد اور سوکھے پھول
بچپن ریت گھروندے بارش تم اور ناؤ کاغذ کی
لگتی ہے ہر یاد پرانی پتے زرد اور سوکھے پھول
جن آنکھوں نے دنیا بھر کو ننگی ناچ نچایا ہے
ان آنکھوں میں آخر پانی پتے زرد اور سوکھے پھول
ہر اک بات پہ ہنسنے والے کیسے بنجر ہونٹ ہوئے
کیسی آنکھوں میں طغیانی پتے زرد اور سوکھے پھول
تیری ہر اک صبح گلاب چنبیلی موتیا اور رویل
میری ہر اک شام سہانی پتے زرد اور سوکھے پھول
دیکھی ہیں دم توڑتی آسیں ناچ رہی تھیں ہونٹوں پر
چھائی تھی ہر سو ویرانی پتے زرد اور سوکھے پھول
دوست محبت جیون ساتھی پا لینے کا نام نہیں
یہ تو مانگتی ہے قربانی پتے زرد اور سوکھے پھول
جھیل سے گہری آنکھیں چاند سے ابرو پھول سے نازک ہونٹ
گر سوچیں تو سب کچھ فانی پتے زرد اور سوکھے پھول
سبز رُتوں میں چھوڑ کے جانے والا آغا کیا جانے
ساون رُت بارش کا پانی پتے زرد اور سوکھے پھول

# حسن جمیل/واہ کینٹ

گلاب جسم کی خوشبو پکارتی تھی مجھے

یہ خواب میں نے کسی شب کے درمیاں دیکھا

بھروسہ کر نہ کسی پر یہ دار فانی ہے
نئی جو چیز تھی کل تک وہ اب پرانی ہے
اس التفات سے میرا جنوں نہ کم ہوگا
زمیں کی پیاس ہے اور آسماں کا پانی ہے
لکھا ہوا تھا پرانی سی اک عمارت پر
شکست وریخت بھی تہذیب کی نشانی ہے
سنا ہی دوں میں تمہیں واقعہ محبت کا
یہ چیز ٹوٹے ہوئے لفظوں کی کہانی ہے
کبھی کبھی تو مرے ذہن میں یہ بات آئی
کہ جیسے خاک بھی افلاک کی نشانی ہے
اسے نکال دیا قیس نے قبیلے سے
دیارِ عشق میں جس نے بھی ہار مانی ہے

ندی ندی میں طلسمات کا نشاں دیکھا
اس ایک عکس کو ہم نے کہاں کہاں دیکھا
گلاب جسم کی خوشبو پکارتی تھی مجھے
یہ خواب میں نے کسی شب کے درمیاں دیکھا
کل اس کو دیکھا کسی اور کی طرف جاتے
اور اس کے پیچھے ہجومِ ستم گراں دیکھا
مرے نصیب میں لکھا تھا دیکھنا اس کو
سو جان بوجھ کے دیکھا نہ ناگہاں دیکھا
حسن جمیل شباہت بھی اس کی یاد نہ تھی
تمام عمر جسے صورتِ بتاں دیکھا

تو اس جہاں کے رہ و رسم کو بدل بھی نہیں
پہ ہو سکے تو زمانے کے ساتھ چل بھی نہیں
اس ایک شعر نے زندہ رکھا ہوا ہے مجھے
وہ ایک شعر کہ جو حاصلِ غزل بھی نہیں
گئے زمانوں کو الزام کس لیے دیتے
کہ مشکلوں کا کوئی حل تو آج کل بھی نہیں
دوبارہ ملنے کا عہد اس لیے نہیں کروں گا
کہ زندگی کا بھروسہ تو ایک پل بھی نہیں
حسن جمیل میں خوش فہمیوں سے ڈرتا ہوں
وہ اس لیے کہ مرے پاس اک عمل بھی نہیں

یہ کس گمان پہ اور جھوٹ پر بنا ہوا میں
پھر اس کے سامنے تھا سر بہ سر بنا ہوا میں
یہ سوچ کر کہ مسافت پہ تو بھی نکلے گی
کھڑا ہوں راہ میں کب سے شجر بنا ہوا میں
یہ خود فریبی مجھے مار ہی نہ ڈالے کہیں
بھٹک رہا ہوں یہاں راہبر بنا ہوا میں
یہ اور بات کہ ہر شب خرید سکتا ہوں
ترے لیے ترے خوابوں میں گھر بنا ہوا میں
سمجھ چکا ہوں زمانے کی ایک اک سازش
یونہی نہیں ہوں یہاں بے خبر بنا ہوا میں
یہ سوچتا ہوں کہ خوشبو کدھر گئی ہے مری
حسن جمیل کسی شاخ پر بنا ہوا میں

جو گیا تھا تری تلاش میں کسی اور سمت نکل گیا
تجھے ناز جس کے جنوں پہ تھا وہی ایک پل میں بدل گیا
سرِ راہ یوں ہی ملا تھا وہ کسی خواب زار طلسم میں
کوئی دن رہا مرے جسم میں مری روح تک کو کچل گیا
مرا اپنا کون سا نام تھا مری اپنی کون سی ذات تھی
جنہیں دیکھتا تھا میں روز و شب انہی آئنوں میں تو ڈھل گیا
گئے موسموں کا دھیان آئے تو سوچتا ہوں میں بات میں
کہ یہ وقت بھی کوئی اژدھا تھا جو خواب سارے نگل گیا
حسن ایک عمر گزر گئی وہی ضد رہی مہ و سال کی
نہ مری نظر ہی جھکی کبھی، نہ ترے ہی ماتھے کا بل گیا


نامور مزاح نگار، کالم نویس، کہانی کار اور شاعر
حافظ مظفر محسن کی شگفتہ تحریر پر مشتمل
انتخاب
"بونا نہیں بے وقوف"
کا تیسرا ایڈیشن شائع ہوگیا ہے
مرتب: حسن عباسی
ناشر
نستعلیق مطبوعات
الفجر ورسنٹر غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور
0300-4489310 / 0423-7351963

## فقیر سائیں/شارجہ

اک شکل ہی آنکھوں سے نگوڑی نہیں جاتی
اُمید وہ منگی ہے جو چھوڑی نہیں جاتی

نادان ہیں وہ ترکِ وفا مانگ رہے ہیں
ہم سے تو یہ سگریٹ ابھی چھوڑی نہیں جاتی

آداب ہوں اُلفت کے یا سڑکوں کے سلیقے
گاڑی بھی تو بے موڑ ہی موڑی نہیں جاتی

ہمدم یہ محبت ہے کوئی کھیل نہیں ہے
ٹکڑوں میں بکھر جائے تو جوڑی نہیں جاتی

اُس کام میں برسوں ہی لگا دیتا ہے مفلس
جس کے لیے ارباب کی کوڑی نہیں جاتی

یہ خون پسینہ ہے تحمل سے مرے دوست
یکلخت ہر ایک چیز نچوڑی نہیں جاتی

آتی ہے تو لگتا ہے زیادہ نہیں آئی
جاتی ہوئی دولت بھی تھوڑی نہیں جاتی

تابوتِ وطن آخری کیلوں سے مزین
آقاؤں کے ہاتھوں سے ہتھوڑی نہیں جاتی

واعظ میں ترے کان میں اتنا ہی کہوں گا
ہر بات کی یوں ٹانگ مروڑی نہیں جاتی

آنکھیں تو بم ہیں مجھے پاؤں نہیں دکھتے
رستے سے یہ اُبھری ہوئی تھوڑی نہیں جاتی

ہر شخص ہی اُس پار اُتر جاتا ہے سائیں
یہ عمر ہے وہ دوڑ جو دوڑی نہیں جاتی

---

مختصر سی بات ہے کیوں جایئے تفصیل میں
منفی کردار ہوں میں وقت کی تمثیل میں

شاہ کے فرمان میں شاید کوئی ابہام تھا
شہر اُلجھا ہی رہا تاویل در تاویل میں

یہ اگر سچ ہے کہ گندم بے بہا پیدا ہوئی
کون آڑے آ گیا لوگوں تلک ترسیل میں

یوں سمجھ لیجے کہ بستی نیم مرداروں کی ہے
چور جب مرنے لگیں پولیس کی تحویل میں

ایسا لگتا ہے قیامت اب ہوئی کہ اب ہوئی
میں پہنچتا ہوں مسلسل صُورِ اسرافیل میں

شمعیں اپنے حصے کی روشن تو کر ڈالوں مگر
موم ہی باقی نہیں سائیں مری قندیل میں

تری محفل سے اُٹھ کے بھی تری محفل میں رہتے ہیں
ہمارا مشغلہ یہ ہے کہ بس مشکل میں رہتے ہیں

لہو گردش میں رکھنے کے سوا یہ کچھ نہیں کرتا
بڑے ثابت قدم ہیں جو ہمارے دل میں رہتے ہیں

کفن سر پر سجانے کی تمنا کس کو ہوتی ہے
مگر ہم کیا کریں کہ کوچہ قاتل میں رہتے ہیں

ہمارے حال سے ہم کو پرکھنا چھوڑ دو صاحب
یا ہم ماضی میں رہتے ہیں یا مستقبل میں رہتے ہیں

نمی پاتے ہی یہ مٹی بڑی زرخیز ہوتا تھی
اسی اُمید کو کے پرتو آب و گل میں رہتے ہیں

ہمارے شہر میں ہر شخص ہی اب شیر ہے سائیں
ہم ایسے منحنی چوہے کہ اک کربل میں رہتے ہیں


فیصل آباد میں مقیم ممتاز شاعر، سفرنامہ نگار
کالم نویس اور ماہنامہ ''حرفِ جعفر''
کے مدیر ڈاکٹر جعفر حسن مبارک کی کتب

① میں نے نشہ چھوڑ دیا ہے
② علم المثلثیات
③ سحر قریب ہے
④ نئے دنوں کے خواب (شاعری)
⑤ دریا سے صحرا تک (سفرنامہ دُبئی)
⑥ تمہارا رہنا سیکھ لیا ہے (شاعری)
⑦ اپنے استنبول میں (سفرنامہ ترکی)

ناشر
مثال پبلشرز
رحیم سنٹر پریس مارکیٹ، امین پور بازار فیصل آباد

## عابد کاظمی/لاڑکانہ

پانی پر لکھی تحریریں، آخر تو مٹ ہی جاتی تھیں
پل دو پل کو خواب کھلے اور ارمانوں کے جگنو چمکے

اُجڑے جیون کی بستی میں، پھر یادوں کے جگنو چمکے
ٹوٹے پھوٹے آئینوں میں، کچھ چہروں کے جگنو چمکے
وقت الگ ہی چال ہے چلتا، بہتا رہتا ہے دریا سا
دیپ بجھے جب آوازوں کے، سناٹوں کے جگنو چمکے
میرے دل کے دروازے پر مدت سے اک دھول جمی تھی
کس نے آ کر پھر دستک دی، ویرانوں کے جگنو چمکے
پانی پر لکھی تحریریں، آخر تو مٹ ہی جاتی تھیں
پل دو پل کو خواب کھلے اور ارمانوں کے جگنو چمکے
دیکھو کورے سے کاغذ پر کتنے رنگ اُتر آئے ہیں
عابد اس کا نام لکھا، تو سب لفظوں کے جگنو چمکے

### مکمل آزادی

میں مکمل آزادی چاہتا ہوں
آزادی جو پیار سے بھی مقدم ہے
اس نے گھور کر دیکھا!
کیا ہر تعلق سے آزادی ممکن ہے؟
تم اپنی تمناؤں کو تیاگ سکتے ہو؟
میری آنکھوں میں تجسس بھر گیا
جانتے ہو مچھلی کے لیے پانی کیا معنی رکھتا ہے؟
وہ کبھی بھی پانی کی قید سے آزاد نہیں ہو پاتی
اس کی آزادی کا دن، اس کی موت ہوگی
جسم اور روح کا تعلق کیا ہے؟
جسم روح کا پنجرہ ہے
مکمل آزادی کے لیے یہ رشتہ توڑنا ہوگا
یہاں، یہ سودہ گھاٹے کا نہیں
لیکن موت ہر چیز کو بے معنی بنا دیتی ہے
پر جن لمحوں میں زندگی حقیقت تھی
کیا وہ موت کی شکست کے لیے کافی نہیں

### نہ جانے کیوں؟

کبھی یوں بھی ہوا کہ بے سبب
کاغذ لپیٹ کر لفظوں کو قید کر لیا
تا کہ وہ اُڑنے سے باز رہیں
میں جب بھی تم سے ملا ہوں
نہ جانے یہ خبر کیسے لوگوں تک جاتی ہے
جب کہ گلی کے نکڑ پر پڑے ہوئے
اندھے کتے سے بھی خود کو چھپاتا ہوں
تیرے سنگ گزاری ہوئی اک شام
میں نے تہہ کر کے کنویں میں ڈالی تھی
ایسے چھپا کے سے گونج کے جاگی وہ
جیسے پانی میں گرے پتھر
چونک اُٹھے سارے پنچھی
اور چیخ کر جنگل کو بھی جگایا
کبھی یوں بھی ہوا کہ خاموشی
تیز آواز میں بولنے لگتی ہے
پیڑوں پر کان اُگ آتے ہیں
پتے زبان اوڑھ کر
ہواؤں کے دوش پر سفر کرتے ہیں
میں استعارے استعمال کرتا ہوں
پر الفاظ چہرہ سجا لیتے ہیں
میں نے ایک ٹوٹی ہوئی نظم کی مرمت کی
جواب فرار ہوگئی ہے
ڈر ہے وہ راستہ نہ بھٹک جائے
میں نے جو راز اس میں چھپائے ہیں
کہیں فاش نہ کر دے ان کو
تجھے میں نے کوئی الزام نہیں دیا
بس کچھ قبریں بنائی تھیں اس میں
ان خوابوں کی
جنہوں نے جنم لیتے ہیں پھندا لگا کر
خودکشی کر لی تھی


برطانیہ میں مقیم معروف نوجوان شاعر
عاصم ندیم کا پہلا شعری مجموعہ
نیا چاند
مکمل اہتمام کے ساتھ شائع ہو گیا ہے
ناشر
نستعلیق مطبوعات
الفجر وڈسٹر غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور
0300-4489310 / 0423-7351963

# ڈاکٹر اخلاق گیلانی/لاہور

میں سنگِ آرزو ہوں خلا میں اُچھال دو
قدموں میں کائنات ہو ایسا کمال دو

میں سنگِ آرزو ہوں خلا میں اُچھال دو
قدموں میں کائنات ہو ایسا کمال دو
ہر شے میں اس کو دیکھ رہا ہوں یہاں وہاں
جس میں نہیں، وہ جلوہ گر ایسی مثال دو
کب تک میں قیل و قال کی زنجیر میں رہوں
تھوڑی سی دیر صورتِ رومی دھمال دو
کب تک رہوں گا پردۂ امکاں کی خاک میں
کن کہہ کے رنگ و نور کو اپنا جمال دو
ہر لمحہ ناچ اُٹھے مرے ناخن کی پشت پر
زنجیر کر کے ہوش کبھی ایسا حال دو
کب سے ہوں اضطراب میں اپنے وصال کے
میں خود سے مل سکوں مجھے اپنا وصال دو
ہر گل الوہیت کی مہک کا امین ہو
اخلاق کے شعور کو سرسبز ڈال دو

---

چلو ہم کریں گفتگوئے محبت
اسی طور ہوں سرخ روئے محبت
جلائیں محبت کی پھر جوت دل میں
مہکنے لگے مشک بوئے محبت
محبت دمادم، محبت سدا دم
ہمیں راس آئی ہے خوئے محبت
مرے من کی ندیا رواں ہو چکی ہے
چھلکتی ہوئی جو یہ جوئے محبت
بچھڑ کر ملا آج محبوب پھر سے
محبت ہوئی روبروئے محبت

زمانے نے اُس کی کہانی لکھی ہے
ہوا ہے جو بھی کام جوئے محبت
اُٹھائے ہوئے ہاتھ دل سے دعا ہے
خدایا رہے آبروئے محبت
ابھی تک مہکتی ہے اخلاق دل میں
گلوں کی طرح آرزوئے محبت

---

ایسا چپ چاپ سا شجر
عمر کیسے کرے بسر
آسمانوں کا ہے سفر
اب عنایت ہو جائیں پر
کوئی ساتھی نہیں اگر
کیسے کاٹیں گے اب سفر
جسم ٹوٹا کچھ اس طرح
درد کرنے لگا اثر
اور ہوائیں نہ دو، رُکو
جل گیا اب تو سارا گھر
ہم نے دیکھا ہے رو کے بھی
کچھ نہیں آہ میں اثر
غور سے دیکھ کر لگا
کتنا مظلوم ہے بشر

---

ہوئی جاتی ہیں اب معدوم سوچیں
تمہی نے کی ہیں یہ مقسوم سوچیں
اُترتے ہیں مری آنکھوں میں آنسو
کہ سوچوں میں تری مظلوم سوچیں
تمہارے چہرے کی وہ سادہ لوحی
تو اس لمحہ مری معصوم سوچیں
تمہاری مسکراہٹ پہ لکھے گیت
رقم کرتے رہے منظوم سوچیں
عطا کر دو مجھے عرفان اپنا
بہت کم ہیں مری معلوم سوچیں

---

اک گھنا شجر ہے ماں
رس بھرا ثمر ہے ماں
روشنی کا گھر ہے ماں
پیار کی سحر ہے ماں
ایک راہبر ہے ماں
وقت کا خضر ہے ماں
ہے مہک محبت کی
پیار کا ثمر ہے ماں
اصل میں فرشتہ ہے
ویسے تو بشر ہے ماں
تو دعائیں کرتی ہے
دل بہ دل خبر ہے ماں
میری زندگی، تیرا
پرتوِ سفر ہے ماں
عکس ہوں ترا ہی میں
مجھ پہ یہ اثر ہے ماں
شاد کی زباں پہ ہے
میری منتظر ہے ماں

## عزیر احمد/لاہور

تجھ سے بچھڑ کے ہاتھ چھڑایا نہ جائے گا
تو جائے گا مگر ترا سایا نہ جائے گا

تھے منسلک ہمارے بھی ارماں کسی کے ساتھ
وہ زندگی کی بات گئی زندگی کے ساتھ
ایسے بھی موڑ آئے محبت کی راہ میں
غم کا ملاپ ہوتا رہا ہے خوشی کے ساتھ
یہ اُن کے رنگِ حُسنِ وفا کا کمال ہے
غصہ ہے اُن کے چہرے پہ لیکن ہنسی کے ساتھ
تارے سے جھلملاتے رہے میرے رُوبرو
اک عمر میرا ربط رہا روشنی کے ساتھ
اس عمرِ مختصر میں بہت کھائے ہیں فریب
محتاط ہو کے چلتا ہوں میں اجنبی کے ساتھ
اُس کے کرم کی کون کرے گا برابری
بخشا ہے اُس نے ہوش بھی دیوانگی کے ساتھ
مرنے پہ اُس کے کس لیے حیراں ہو تم عزیر
یہ حادثہ تو ہونا ہے اک دن سبھی کے ساتھ

---

تجھ سے بچھڑ کے ہاتھ چھڑایا نہ جائے گا
تو جائے گا مگر ترا سایا نہ جائے گا
ہم ہیں تمہارے صحن کی دیوار کی طرح
تم تک کسی بھی خوف کا سایا نہ جائے گا
گرہیں پڑی ہوئی ہیں ہماری زبان میں
یہ حال ہے تو حال سنایا نہ جائے گا
چہرے پہ آئے گی تری یادوں کی روشنی
مجھ سے ترا خیال چھپایا نہ جائے گا
تو میرے ساتھ ہے مرے احساس کی طرح
تیرے بغیر وقت بتایا نہ جائے گا
مل بیٹھنے کی تو کوئی صورت ابھی نکال
پھر تو یہاں عزیر سے آیا نہ جائے گا

---

اس شہر میں ہیں یوں تو مسائل سبھی کے ساتھ
اک میں کہ جی رہا ہوں تمہاری کمی کے ساتھ
ممکن نہیں اُسے وہاں سانسوں سے باندھنا
اک پل میں ٹوٹ جائیں جہاں زندگی کے ساتھ
اتنا بھی خوش نہ ہو مجھے گھر سے نکال کر
ہوتے ہی صبح آؤں گا میں روشنی کے ساتھ
آنسو کی طرح مجھ کو گرانے کا فائدہ
مجھ سے بچھڑنا ہے تو بچھڑ جا خوشی کے ساتھ
دنیا کے ساتھ اپنی رفاقت کا کیا کہوں
اک اجنبی ہو جیسے کسی اجنبی کے ساتھ
کیسے اُسے یقین دلاؤں کہ اُس کا ہوں
میں ہوں کسی کے ساتھ مرا دل کسی کے ساتھ
اک دوسرے کو عشق جتاتے تو ہیں یہ لوگ
لیکن عزیر کوئی نہیں ہے کسی کے ساتھ

---

یہ کس انجان دنیا کا سفر ہے
مرا سایا بھی مجھ سے بے خبر ہے
جھپک سکتا نہیں میں پلکیں اپنی
مجھے تجھ سے بچھڑ جانے کا ڈر ہے
مثالِ ابر اُڑتا جا رہا ہوں
تمہارے شہر سے شاید گزر ہے
کریں نفرت بھلا کیا زندگی تو
محبت کے لیے بھی مختصر ہے
تری یادوں کے بیٹھے ہیں پرندے
یہ دل جیسے کوئی اُجڑا شجر ہے
عزیر احمد بھٹک سکتا نہیں میں
برابر مجھ پہ مرشد کی نظر ہے
عزیر اس خوف سے روتا نہیں ہوں
کہ دریا کے کنارے میرا گھر ہے

---

جب بھی یاد آئے ترا لہجہ محبت والا
مجھ سے ہو جائے کوئی مصرعہ محبت والا
چاند سورج سے پرانی ہے کہانی اس کی
پھر بھی لگتا ہے نیا قصہ محبت والا
اپنے ہونٹوں سے کسی روز مجھے لکھنا ہے
اس کے ہونٹوں پہ کوئی جملہ محبت والا
یونہی بیکار نہیں بانٹ رہا لوگوں میں
کام آئے گا یہی سکہ محبت والا
میری تلخی پہ کبھی تلخ نہ ہونا میرے دوست
غصہ ہوتا ہے مرا غصہ محبت والا
دفن کرنا مجھے فرہاد کے پہلو میں عزیر
مجھ کو بھی مار گیا تیشہ محبت والا
اس لیے دشت میں گزری ہے مری عمر عزیر
شہر کو جاتا نہیں رستہ محبت والا

---

جس طرح بچہ کھلونے سے بہل جاتا ہے
دل کچھ ایسے ترے ہونے سے بہل جاتا ہے
شہر بھی جیسے تھکا ہارا مسافر ہے کوئی
شب سرا میں ذرا سونے سے بہل جاتا ہے

بقیہ حصہ

**ارژنگ:** کیا فلمی گیت لکھنا مشکل ہے؟

**احمد عقیل روبی:** جو لوگ گیت کو سمجھتے ہیں ان کے لئے لکھنا مشکل ہے اور جو نہیں سمجھتے ان کے لئے آسان ہے۔

**ارژنگ:** آپ کے ہاں اردو میں دیگر زبانوں خاص طور پر ہندی کے کافی الفاظ ملتے ہیں اس کی کوئی خاص وجہ؟

**احمد عقیل روبی:** آپ باغ لگانے والے کو یہ کیوں کہتے ہیں کہ اس میں ایک ہی قسم کے پودے لگائیں۔ اگر زمین ذرخیز ہے تو آپ اس میں ہر قسم کا پودا لگا سکتے ہیں۔ زبان کا دامن اسی طرح ہی وسیع ہوتا ہے۔ جارج اسٹائل اپنی تنقید کی پہلی باقاعدہ کتاب میں جب بحث کرتا ہے تو کہتا ہے لفظ کچھ اجنبی، کچھ غیر ملکی، کچھ غیر زبان کے ہوتے ہیں۔ آپ وہ لفظ استعمال کرنے میں پرہیز نہ کریں۔ لیکن ان کو اس طرح استعمال کریں کہ وہ آپ کی زبان میں آ کر اجنبی محسوس نہ ہوں۔ چنانچہ میں نے جو لفظ استعمال کئے ہیں لوگوں نے یہ تو کہا کہ آپ نے ہندی کے لفظ استعمال کئے ہیں۔ لیکن کسی نے یہ نہیں کہا کہ بہت برے طریقے سے استعمال کئے ہیں۔

**ارژنگ:** آپ کی شخصیت کے مختلف پہلو ہیں۔ آپ شاعر، ڈرامہ نگار، فلمی کہانی کار، نقاد اور سوانح نگار ہیں۔ آپ کو اپنا کون سا پہلو اچھا لگتا ہے۔

**احمد عقیل روبی:** بدل بدل کر لباس پہننا انسانی فطرت ہے۔ گلیشئر کی طرح آدمی کی مختلف سطحیں ہیں۔ شاید میں ان تمام راستوں پر چلنا چاہتا ہوں جو میرے اندر پھیلے ہوئے ہیں۔ اس امید پر کہ شاید کسی دن منزل تک پہنچ جاؤں۔

**ارژنگ:** کامیاب اور مشہور ادیب یا شاعر بننے کا گر کیا ہے؟

**احمد عقیل روبی:** اچھا کھلاڑی وہ ہے جو کھیل کے تمام اصول و قواعد جان کر میدان میں اترے۔ چنانچہ شاعر کو شاعری شروع کرنے سے پہلے شاعری کے بارے میں سب کچھ جاننا چاہئے۔ وہ شاعری جو بغیر کسی علمی پس منظر اور ریاضت کے کی جائے اس کا نہ چھپنا ہی بہتر ہے۔ برا شعر کہنے والا شاعر جونک کی طرح ہوتا ہے جو قاری کا خون چوستی رہتی ہے۔

**ارژنگ:** کیا یہ کہہ کر آپ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ شکنی نہیں کر رہے؟

**احمد عقیل روبی:** نہیں بلکہ میں نئے لوگوں کو شاعری کرنے کا گر سکھا رہا ہوں۔ میں ان سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ نہ کاغذ ضائع کریں اور نہ وقت۔ جب ورکشاپ کے چھوٹے دس بارہ سال کی ٹریننگ کے بعد مستری بنتے ہیں۔ تو شاعری کے لئے ریاضت ممنوع کیوں ہے۔ یہ مفت میں ہی فیض کی برابری کرنا چاہتے ہیں۔

**ارژنگ:** ہمارے ہاں ناقدین عدل سے کام لیتے ہیں یا تعصب سے؟

**احمد عقیل روبی:** ہمارے نقاد ان چیزوں کا استعمال کر رہے ہیں۔ کہیں اتنا عدل برتتے ہیں کہ دس غزلوں کے شاعر کو فیض کے برابر لا کھڑا کرتے ہیں اور کہیں اس قدر تعصب سے کام لیتے ہیں کہ شاعر اگر اپنے گروپ کا نہ ہو تو اس میں انہیں کوئی خوبی سرے سے نظر ہی نہیں آتی۔ ہمارے ہاں تنقید اور تخلیق کی بربادی کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے۔

پنجابی کے نامور شاعر

**خاقان حیدر غازی کی کتب**

① بند گلی وچ شام (شاعری)
② دم دم دم نال دھمال (شاعری)
③ مادھو نال صلاح (شاعری)
④ سے داگیان (شاعری)
⑤ میں چیتر نہیں چکھیا (شاعری)
⑥ ساون لے اُڈیک (لوک کہانیاں)
⑦ کہے شاہ حسین (منظوم سٹیج ڈرامہ)

ناشر

**سانجھ پبلی کیشنز**

**صفاں والا چوک، لاہور**

بقیہ حصہ

جہاں ہمیں اچھے انجینئرز، ڈاکٹرز، وکلاء اور لیڈرز چاہئیں وہاں ہمیں عظیم ادیب، مصور، شاعر، موسیقار اور دانشور بھی چاہئیں زندہ قوموں کی تو یہی روایات ہوتی ہیں اقوام عالم میں اگر سر اٹھا کر کھڑا ہونا ہے تو ہمارے ادیب کو ذمہ دار ہونا ہوگا ہمارا عظیم ادیب قوم کی سوچوں کا رخ موڑ سکتا ہے۔ جو ترقی پر منتج ہوگا۔ ایک شاعر پاکستان کا مصور ہوسکتا ہے تو شعراء اور ادباء اسے ایک ترقی یافتہ ملک بھی بنا یا ہوا سکتے ہیں۔

س: آپکے اندر طنز و مزاح فطری طور پر موجود ہے باقی اصناف کی نسبت اس صنف میں کم کیوں لکھا جارہا ہے؟

جواب: ادب میں مزاح خاصے کی چیز ہے میں نے بچپن میں ذہنی تلذذ کیلئے بھی مزاح نگاروں کو پڑھا پھر کچھ حاصل کرنے کیلئے دوبارہ پڑھا۔ انگلش مزاح نگاروں میں پی جی وڈ ہاؤس کو اور مارک ٹوئین کو پڑھا۔ مارک ٹوئین لکھتے ہیں بچپن میں ہم اتنے غریب تھے کہ رکھوالی کیلئے کتا نہ رکھ سکتے تھے اس لئے رات کو اگر ہمارے گھر کوئی چور آ جاتا تو مجھے بذات خود اور بقلم خود بھونکنا پڑتا تھا۔ شستہ شگفتہ اور بے ساختہ مزاح لکھنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں اسی لئے اس صنف میں کم لکھا جارہا ہے۔

س: محبت ایک پٹا ہوا موضوع ہے اس کے متعلق جدید ادبی تخلیقات میں کیا تبدیلی ہے؟

جواب: محبت کا جو رخ دبستان دلی اور دبستان لکھنؤ میں تھا بانکے پان کھا کر سلیم شاہی جوتے اور چوڑی دار پہن کر پالکی میں بیٹھ کر مشاعروں میں بل کھاتی لچکیلی کمر یا کے ساتھ لہراتے ہوئے نازو انداز سے جاتے تھے وہ دور تو غالب کے بعد ختم ہوگیا اور جب فیض نے کہا کہ

تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

تو محبت کا منظر نامہ یکسر بدل گیا اس دور میں محبت کرنے والے نوجوان کو محبوب کی بجائے روزگار اور تنخواہ کی فکر رہتی ہے۔

کس ضرورت کو دباؤں کسے پورا کرلوں
اپنی تنخواہ کئی بار گنی ہے میں نے

گل و بلبل کے قصے نظم کرنے والے شاعر کو بھی اب بھوک بیماری جہالت جنگ خودکش دھماکوں اور دہشت گردی کے موضوعات پر لکھنا ہوتا ہے اور یوں محبت اک ثانوی حیثیت اختیار کرگئی ہے بلکہ اب تو محبتیں کمرشلائز ہوگئی ہیں خلوص عنقا ہوگیا بلکہ رخصت اتفاقیہ پر چلا گیا۔

س: ادب کی ترویج کے لئے قائم اداروں کی کارکردگی سے مطمئن ہیں؟

جواب: میں نے کچھ ملکوں کی سیاحت کے دوران بھارتی سیاحوں کو اپنی کتب پیش کیں تو اردو بولنے والے اردو فلمیں دیکھنے والے یہ لوگ میری اردو کتب کو پڑھ نہ سکے وہ مردم شماری کے وقت اپنی زبان ہندی لکھتے ہیں بھارت میں تو بہت حد تک اردو کا ''تحت بالخیر'' ہونے والا ہے پاکستان میں پچھلے بیس سال سے انگلش سکولوں نے طلباء کو سپوکن انگلش کا ایسا ہیضہ کروایا ہے کہ نئی نسل میں سے 90 فی صد نوجوان طلباء کو اردو ادب سے کوئی لگاؤ نہیں ان حالات میں مقتدرہ اور اکادمی ادبیات کے علاوہ اورینٹل کالج اور یونیورسٹی کے اساتذہ کو شعر و ادب کی ترویج کیلئے ہنگامی اقدامات اٹھانا ہونگے ورنہ اردو ہمارے ہاں بھی ناپید ہوجائے گی یا خام بدھن نسیاً منسیا ہوجائے گی اداروں کی کارکردگی ہے ہی نہیں تو اطمینان کہاں ہوگا اردو سائنس بورڈ کو بھی ہمیں فعال بنانا ہوگا۔

س: کیا ادیب کو نظریاتی ہونا چاہیے؟

جواب: جی ہاں! مگر متعصب اور متشدد نہیں ہونا چاہیے ادب کی چاشنی پہلے ہو نظریہ بعد میں ہو یا بین السطور ہو۔ سرسید احمد کی طرح نہ ہو کہ وہ مصلح پہلے تھے ادیب بعد میں۔

س: ڈاکٹر سلیمان عبداللہ اور ادیب سلیمان عبداللہ میں کیا فرق ہے؟

جواب: میرے متعلق جیسے عطاء الحق قاسمی صاحب نے لکھا کہ ادیب وہ پہلے سے ہے ڈاکٹر تو بعد میں بنا ڈاکٹر سلیمان عبداللہ دو اور دو چار کہتا ہے ادیب سلیمان عبداللہ دو اور دو بائیں ہوں تو انہیں بھی بجا اور ٹھیک سمجھتا ہے۔ ڈاکٹر سلیمان بے ترس ہو کر چیرا لگاتا ہے اور ادیب سلیمان کسی کو ذرا سی تکلیف میں دیکھے تو اس کا دل بھر آتا ہے ڈاکٹر سلیمان مریضوں میں ہو اور ادیب دوست آجائیں تو اس کا ہسپتال ادبی ڈیرے میں کنورٹ

ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر سلیمان سپرٹ کی بو میں رہتا ہے ادیب سلیمان بادصباء اور گلاب کی خوشبو میں خراماں خراماں معطر معطر رہنا چاہتا ہے۔

س: موجودہ دور میں اگر ن م راشد فیض اور مجید امجد ہوتے تو کیا انہیں موجودہ مقام مل پاتا؟

جواب: ن م راشد میرے قصبہ علی پور چٹھہ میں پیدا ہوئے میٹرک یہاں سے کیا جن دنوں ''ایران میں اجنبی'' شائع ہوئی تو علی پور آئے میرے اباجی ہیڈ ماسٹر تھے انہیں مل کر دسویں کے کمرے میں وہ ڈیسک بھی دکھایا جہاں وہ بیٹھتے تھے پچھلی نصف صدی میں ہونے والی ہوشربا ترقی میں اگر یہ شعراء ہوتے تو صرف تھوڑے عرصہ کیلئے معروف ہوتے پھر گم نامی منہ کھولے انہیں دیکھ رہی ہوتی مثال کے طور پر غالب اگر دوسو سال بعد بھی ادب میں ''اِن'' ہیں تو کیا اب سے دوسو سال بعد پروین شاکر بھی اسی طرح ''اِن'' ہونگی؟ کبھی نہیں! دنیا جتنی تیزی میں افراتفری اور ''برقی'' میں ہے آئندہ آنے والے دور میں کھیل سیاست یا ادب کے میدان میں معروف ہونے والا بندہ انٹرنیٹ اینڈرائیڈ موبائل آئی کان واٹ سیپ، ٹیب لیٹ اور فیس بک پر صرف 15 منٹ کیلئے مشہور ہوگا اور پھر اس کی جگہ کوئی اور لے لے گا مگر یہ بھی اک حقیقت ہے کہ موجودہ دور ن م راشد، مجید امجد اور فیض پیدا کر ہی نہیں سکتا۔

س: کیا ادیب کا سیاست میں کردار ہونا چاہیے؟

جواب: جس ملک کی قومی اسمبلی میں دو تہائی اکثریت جہلا کی ہو اور انکی بی اے کی ڈگریاں جعلی نکلیں تو اس ملک میں سیاست کے میدان کو خالی کیوں چھوڑا جائے اس میں ادیب اور شاعر کو ایک دانشور کی حیثیت سے حصہ لینا ہوگا کہ ہمارے سیاسی نظام میں صرف جاگیردار اور ناجائز منافع خور امراء ہی اسمبلی تک پہنچ سکتے ہیں مگر ادیب اس میدان میں آتے رہیں گے تو کسی نہ کسی روز ہماری قوم کو بھی عقل آجائے گی جیسے برطانیہ کی مدر پارلیمنٹ میں یونیورسٹی کے پروفیسرز اسمبلی کے ممبر منتخب ہوتے ہیں چار سال قوم کی خدمت کرتے ہیں پھر واپس اُسی یونیورسٹی میں پڑھانے کیلئے چلے جاتے ہیں۔

س: آپ کا نظریہ ادب کیا ہے؟

جواب: منافقت نہ ہو دھڑے بندی نہ ہو ادبی جنگ و جدل نہ ہو تو آموز لکھاریوں کی حوصلہ افزائی ہو۔

س: آپ کے خیال میں ادارہ اژرنگ کو وہ کونسا سوال پوچھنا چاہیے تھا جو ہم نے نہیں پوچھا؟

جواب: میرے خیال میں آپ کو پوچھنا چاہیے تھا کہ اگر مجھے دوبارہ زندگی ملے تو میں کیا بننا پسند کروں گا تو میرا جواب ہوتا میں ڈاکٹر خواجہ زکریا، اشفاق احمد، عطاء الحق قاسمی اور واصف علی واصفؒ بننا پسند کرتا۔ شعر و ادب کی ترویج میرا مشن ہوتا یہی میری زندگی ہوتا۔

س: قارئین کیلئے کوئی پیام!

جواب: میر کارواں ہیں

نگہ بلند سخن دلنواز جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کیلئے

## غزل / حسن عباسی

قدیم آگ سے رشتہ نیا بناتے ہیں
ہم اپنی آنکھ سے شعلہ نیا بناتے ہیں
فسردہ ہونے نہیں دیتے ہم محبت کو
پرانی بات سے جھگڑا نیا بناتے ہیں
تمام رات عجب دور چلتا رہتا ہے
نئی کتاب سے نشہ نیا بناتے ہیں
خوش آنکھوں سے ملتی ہے شہزادہمیں
ہم اس خوشی سے قصہ نیا بناتے ہیں
تمہارے لب کی طرح ایک بھی نہیں بنتا
ہزار طرح سے مصرعہ نیا بناتے ہیں
پرانے دوست سے چلتا ہے اور حساب اپنا
نئے کے ساتھ تو کھاتہ نیا بناتے ہیں
ہم اپنے آپ پہ کرتے ہیں اس کو خرچ حسنؔ
جو کُڑھتے رہنے سے غصہ نیا بناتے ہیں


بچوں کے معروف ادیب، حمد، نعت اور
جدید غزل کے ممتاز شاعر
**زاہد محمود شمس** کا نعتیہ مجموعہ
**پیارے محمد ﷺ**
مکمل اہتمام کے ساتھ شائع ہوگیا ہے
صفحات 144 قیمت 200 روپے
ناشر
**نستعلیق مطبوعات**
الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور
0300-4489310 / 0423-7351963

دھوپ کا رازدان ہوتا تھا
میں کبھی سائبان ہوتا تھا
پاؤں نیچے زمین ہوتی تھی
ساتھ ہی ساتھ آسمان ہوتا تھا
چھپ دکھاتے تھے مہ جبیں اپنی
دل کہاں مہربان ہوتا تھا
اس قدر ساتھ تھیں گھروں کی چھتیں
ایک چھت کا گمان ہوتا تھا
گرمیوں میں چھتوں پہ سوتے تھے
پاسباں آسمان ہوتا تھا
شب کو ٹھنڈی ہوائیں چلتی تھیں
ساحلوں کا گمان ہوتا تھا
رات پھولوں کی سیج ہوتی تھی
دن اگر قہرمان ہوتا تھا
شادیاں جب گلی میں ہوتی تھیں
ہر کوئی میزبان ہوتا تھا
کوئی خوشحال تھا یا کوئی غریب
ہر کوئی شادمان ہوتا تھا
ہر کوئی دوسرے کی کشتی تھا
ہر کوئی بادبان ہوتا تھا
حاجی بابا ہمارے کوچے کا
سارے بچوں کی جان ہوتا تھا
گاؤں سادہ دلوں کے مسکن تھے
شہر، شہر امان ہوتا تھا
چاند تاروں سے دوستی کے سبب
سارا روشن مکان ہوتا تھا
منزلیں ساتھ ساتھ چلتی تھیں
راستہ مہربان ہوتا تھا
شہر لاہور تیری گلیوں میں
اک سنہری مکان ہوتا تھا
ایک مہماں وہاں پہ ٹھہرا تھا
جس کا میں میزبان ہوتا تھا
حُسن ہوتا تھا سامنے میرے
اور حُسنِ بیان ہوتا تھا
وہ سمجھتا تھا ان کہی میری
وہ مرا ترجمان ہوتا تھا
غم کی گھڑیوں میں بھی اسے مل کر
دل میرا شادمان ہوتا تھا
ہے کوئی فائدہ بتانے کا؟
میں کبھی نوجوان ہوتا تھا

عطاء الحق قاسمی

## ایک نظم

سنو لڑکی!
یہ ہم جو لفظ کی مالا پروتے ہیں
یہ ہم جو اپنی آنکھوں کے کناروں کو خوشی سے بھگوتے ہیں
یہ ہم جو درد کی لہروں کو مصرعوں میں سموتے ہیں
یہ سب آساں نہیں ہوتا
کہ دل کو خون کرنا اور اس کارزیاں پر مسکرانا
اس قدر آساں نہیں ہوتا
کبھی پروین شاکر کی مدھر آواز میں یہ تجربہ ہم تک پہنچتا ہے
کبھی یہ مصطفیٰ زیدی کے لہجے میں لہو کی داستاں
بن کر ابھرتا ہے
کبھی محسن کے رختِ شب سے ہم آواز ہوتا ہے
مجید امجد، شکیب اور فیض کا فیضان ہے ہم پر
سو قصہ مختصر ہم سب کتابِ درد سے آغاز کرتے ہیں
کہانی مشترک ہوتی ہے پر عنواں نہیں ہوتا
یہ سب آساں نہیں ہوتا
سنو لڑکی!
یہ ہم شاعر بہت حساس ہوتے ہیں
اُداسی بال بکھرائے ہمارے ساتھ چلتی ہے
ذرا سی بات کو ہم دل پہ لے لیتے ہیں اور
ہفتوں مہینوں تک
ہمارے روز و شب اپنے نہیں رہتے
ہم اپنی رائیگانی سے محبت کرتے رہتے ہیں
نظر آتے ہیں زندہ پر مسلسل مرتے رہتے ہیں
ہمارے قافلے میں، قافلے والے تو ہوتے ہیں
سر و ساماں نہیں ہوتا
یہ سب آساں نہیں ہوتا
تم اس کارزیاں کے کھیل میں آ ہی گئیں آخر تو ایسا ہے
کہ اپنے پاؤں کے چھالوں کو تم نے پھول کہنا ہے
ہوا کی سسکیاں سن کر انہیں نغموں کی صورت
سینۂ قرطاس پر تحریر کرنا ہے
یہ تم جو شاعری کا قفلِ ابجد کھولنے نکلی ہو تو سن لو

کہ اس کا اسم اعظم صرف خود کو مار رکھنا ہے
نفی کرنا ہے اپنی ذات کو اور لفظ کی حرمت کو
حرزِ جاں بنانا ہے
یہ وہ تکلیف ہے جس کا کوئی چارہ نہیں خالد
یہ ایسا درد ہے جس کا کوئی درماں نہیں ہوتا
یہ سب آساں نہیں ہوتا

**خالد شریف**

سورج تھوڑا مدھم ہونا چاہیے تھا
عالم اور ہی عالم ہونا چاہیے تھا
چاند پہ جب سیارہ اترا تب اس پر
سبز ہلالی پرچم ہونا چاہیے تھا
جس پانی کی اس دھرتی کو عادت ہے
اس کو آبِ زم زم ہونا چاہیے تھا
اس دھرتی کے حسن مکمل کے آگے
فطرت کا بھی سر خم ہونا چاہیے تھا
جب تقسیم ہوئی تو اس کے حصے میں
میرا حصہ بھی ضم ہونا چاہیے تھا
ہونا چاہیے تھا غم بھی اس دھرتی پر
لیکن تھوڑا کم کم ہونا چاہیے تھا
ناصر اس روشن روشن سی بستی کا
ہالہ ماہ و انجم ہونا چاہیے تھا

**ناصر علی**

آخری عمر ہے، بم ہے سفر
کم نہیں، اب بہت ہی کم ہے سفر
لمحہ بھر کو جدا نہیں ہوتا
ایسے پیروں کے ساتھ ضم ہے سفر
آپ کے کارواں میں شامل ہوں
آپ کی طرح محترم ہے سفر
تو یہ تو بستیاں دکھاتا ہے
ایسے دیکھیں تو اک کرم ہے سفر
رستہ رستہ ہے آشنا ان سے
میرے تلووں پہ یوں رقم ہے سفر
کیا بتائے سفر کا غم راشد
دوستو کائنات غم ہے سفر

**محمد ممتاز راشد**

اک پیپل، اک بڑ ہوتا تھا
پاس ہی اک جوہڑ ہوتا ہے
پیڑ برہنہ ہو جاتے تھے
زور پہ جب پت جھڑ ہوتا تھا
بچپن میں ہنگامے کب تھے
گاؤں سکوں کا گڑھ ہوتا تھا
ہونٹوں پر گالی آتے ہی
دادا کا تھپڑ ہوتا تھا
گھر گھر ہوتی تھی اک شدنی
گھر گھر اک اکھڑ ہوتا تھا
شیرنی غیظ میں جب آتی تھی
شیر وہاں لیڈر ہوتا تھا
منزل مل جاتی تھی، گرچہ
رستے میں کیچڑ ہوتا تھا
بہہ جاتی تھیں جھگیاں، فصلیں
جب دریا میں ہڑ ہوتا تھا
قصہ گو کے ٹن ہوتے ہی
سب قصہ گڑبڑ ہوتا تھا
پنچایت میں اکثر راشد
پیسوں کا رپھڑ ہوتا تھا

**محمد ممتاز راشد**

بلندیوں سے گریں تو ٹوٹیں نہ خواب کیسے
رہِ طلب میں سوال کیسے، جواب کیسے
یہ زندگی کتنی غیر محفوظ ہو گئی ہے
یہ قاتلوں نے پہن لیے ہیں نقاب کیسے
سفید ہوتا ہے خون کس طرح آدمی کا
عزیز رشتوں کے بند ہوتے ہیں باب کیسے
بتانا ممکن نہیں کہ صحرا کی وسعتوں میں
لپٹ کے پیروں سے چیختے تھے سراب کیسے
ملا ہوا ہے تمہارا قانون مجرموں سے
کرو گے غارت گروں کا تم احتساب کیسے
تمہیں خبر ہے کہ ہم غریبوں کی بستیوں میں
غروب ہوتے ہیں عمر کے آفتاب کیسے
نظامِ زر قتلِ آدمیت کا مرتکب ہے
جو یہ نہ بدلا تو آئے گا انقلاب کیسے
خزاں کو بھی مات دے کے رکھ دی ہے اس گھٹن نے
کھلیں گے دوزخ کی اس تپش میں گلاب کیسے
ہجومِ فاقہ کشاں تھا، تم تھے، کتابِ جاں تھی
میں کرتا اس کا تمہارے نام انتساب کیسے

**سرور ارمان**

اہلِ دل اب عہدِ رفتہ کی نشانی ہو گئے
خواب سارے دیدۂ تر کی کہانی ہو گئے
ریزہ ریزہ ہو گئیں سب پتیاں احساس کی
چہرے سب زیرِ پلک پانی ہی پانی ہو گئے

کپکپاتے لب پہ بیٹھی ان کہی سی داستاں
سوچ کے سارے پرندے لامکانی ہو گئے
جستجو کے پھول پر کچھ تتلیاں اُڑتی رہیں
خوشبوؤں کے سارے لہجے رایگانی ہو گئے
یہ جنوں خیزی بدن میں فصلِ گل مہکا گئی
چشمِ حیراں میں چمکتے رنگ دھانی ہو گئے
ایک گہری چوٹ جینے کا بہانہ بن گئی
ظلم تیرے مجھ پہ تیری مہربانی ہو گئے
اک تصور دے گیا آنکھوں کو ساون آس کا
دھڑکنوں کے رنگ سارے آسمانی ہو گئے

**آسناتھ کنول**

## تمنائی

اُسے کہنا
دسمبر آنے والا ہے
اُسے کہنا
دسمبر کے مہینے میں
جہاں ہم ساتھ ہوتے تھے
وہ دیواریں
وہ دروازہ
وہ کمرہ اب بھی تجھ کو یاد کرتے ہیں
اُسے کہنا
تری زُلفیں بکھرنے کا
زمانہ یاد آتا ہے
اُسے کہنا
مرے شانے پہ سر رکھ کر
ترا مدہوش ہو جانا
ترا بے تاب ہو جانا
ترا بے باک ہو جانا
ترے نازک تراشیدہ لبوں کا
خشک ہو جانا
تری آنکھوں کے ڈوروں سے
ترے جذبے عیاں ہونا
تری پلکوں کا بوجھل پن
"تمنائی"
مری قربت کے لالہ زار سے
ہر پھول چننے کا
اُسے کہنا
ترے ہاتھوں کی لرزش
یاد آتی ہے
اُسے کہنا دسمبر
آنے والا ہے

**احمد سبحانی آکاش**

تجھ کو سوچوں میں سُو بہ سُو ہو کر
میں تو بس رہ گئی ہوں تو ہو کر
یہ ترے لمس کا کرشمہ ہے
پھیل جاتی ہوں رنگ و بو ہو کر
تو نہ ہو تو میں بانجھ مٹی ہوں
راکھ ہو جاؤں بے نمو ہو کر
ہے تری قید میں ہی آزادی
ڈھانپ لے مجھ کو چار سُو ہو کر
آئنہ ہوں ترے وجود کا میں
آ کبھی دیکھ روبرو ہو کر
ہر گھڑی میرے لب پہ رہتا ہے
نازؔ وہ شخص گفتگو ہو کر

**ناز بٹ**

وفا سے کھیلتے ہیں زندگی سے کھیلتے ہیں
وہ سارا کھیل بڑی سادگی سے کھیلتے ہیں
اُتر رہی ہے دھنک آرزو کے آنگن میں
چلو کہ ہم بھی گلابی کلی سے کھیلتے ہیں
تمام عمر یہ افسردگانِ محفلِ گل
دیارِ آس میں دیوانگی سے کھیلتے ہیں
سلام کرتی ہے اُن کو جنون کی محفل
جو ساحلوں پہ کھڑے تشنگی سے کھیلتے ہیں
تمہارا عکس خیالوں میں ہو تو ہم صاحب
سرو کیف کی آسودگی سے کھیلتے ہیں

**ہمایوں پرویز شاہد**

## پہلا حوالہ

چلو اُس پار چلتے ہیں
جہاں پر دل کی دھڑکن بھی
ہمیشہ رقص کرتی ہے
کسی مجذوب کی صورت
جہاں آنکھوں میں رہتی ہے
سدا محبوب کی صورت
چلو اُس پار چلتے ہیں
جہاں لمحہ بہ لمحہ ہر گھڑی
تازہ اُجالا ہے
جہاں پر روشنی انسان کا
پہلا حوالہ ہے

**وسیم عباس**

# سیالکوٹ

راز اندر ہی سموتا سمندر ہوتا
دل کوئی روز نہ روتا تو سمندر ہوتا
تیری ضد نے تجھے تالاب بنا رکھا ہے
تو مرے پاؤں بھگوتا تو سمندر ہوتا
میں وہ دریا ہوں جو آہستہ روی میں سوکھا
میں اگر ست نہ ہوتا تو سمندر ہوتا
کر گئی جھیل مجھے امن پسندی میری
بستیاں میں بھی ڈبوتا تو سمندر ہوتا
ہار کر چشمۂ خوابیدہ تہِ سنگ گراں
اور کچھ دیر نہ ہوتا تو سمندر ہوتا
یہ بگولے یہ مدو جزر مری مٹی کا
میں اگر دشت نہ ہوتا تو سمندر ہوتا
آب شفاف لیے یہ جو کنواں ہے شاہد
داغ دو چار کے دھوتا تو سمندر ہوتا

**شاہد ذکی**

دو چار ہاتھ، ہاتھ سے آگے نکل گیا
میں تیری کائنات سے آگے نکل گیا
یہ عشق میرا مسئلہ تھا ہی نہیں، سو میں
اس ساری واردات سے آگے نکل گیا
اُس کا وجود ایک صحیفہ تھا میں جسے
پڑھتا ہوا حیات سے آگے نکل گیا
وہ آگہی کا باب کھلا تھا کہ ایک دن
میں خود بھی اپنی ذات سے آگے نکل گیا
دونوں ہی ایک وقت میں گھر سے چلے مگر
سورج اندھیری رات سے آگے نکل گیا
مجھ کو اتنا عزیز تھی سو تشنگی لیے
چپ چاپ ہر فرات سے آگے نکل گیا

**میثم علی آغا**

سلسلے وار تک نہیں آئے
یار دو چار تک نہیں آئے
حال دل پوچھنے مرے اپنے
میرے دربار تک نہیں آئے
دشمنی دشمنی تلک، سو ہم
تیری دستار تک نہیں آئے
وقتِ رُخصت میں رُک بھی سکتا تھا
آپ اصرار تک نہیں آئے
بات دل کی لبوں پہ تھی لیکن
لفظ اظہار تک نہیں آئے
میں ادھر منتظر رہا ساحل
اور وہ اس پار تک نہیں آئے

**ساحل سلہری**

وہ اپنی سوچ میں ترمیم کرنے والا تھا
مرے مقام کو تسلیم کرنے والا تھا
وہ اس لیے بھی بہت یاد آ رہا ہے مجھے
وہ دوست عزت و تکریم کرنے والا تھا
اسی سبب مری آنکھیں نکال دی گئی ہیں
میں روشنی یہاں تقسیم کرنے والا تھا
بدن سے روح بھی پرواز کر گئی اس وقت
زمانہ جب مری تعظیم کرنے والا تھا
اسی سے ان دنوں اندیشۂ عداوت ہے
جسے اک اسم میں تعلیم کرنے والا تھا
لبِ فرات کوئی تشنہ لب تھا یاد آیا
میں ذکر کوثر و تسنیم کرنے والا تھا
عزائی اُس نے تشدد سے ہاتھ کھینچ لیا
میں اپنے جرم کو تسلیم کرنے والا تھا

**اعجاز عزائی**

جب بھی کبھی خیال میں اونچا اُڑا ہوں میں
بے پر ہوں اتنا سوچ کے نیچے گرا ہوں میں
اپنی وفا کے خول میں جل کر بجھا ہوں میں
جیسے کسی غریب کے گھر کا دیا ہوں میں
گم گرد میں ہوں آج میں اپنی تو کیا ہوا
مدت سے ایک جادۂ منزل رہا ہوں میں
قید حرف میں تھا تو در بے مثال تھا
گوہر شناس آنکھ سے رُسوا ہوا ہوں میں
مجھ کو کسی کے لمس نے خوشبو بنا دیا
پھولوں کو یہ گمان ہے ان کی ہوا ہوں میں
طالب چلا تھا قافلہ اک بن کے دور تک
منزل جو آئی سامنے تنہا کھڑا ہوں میں

**مرزا یونس طالب**

# بہاولپور

ہم نے اس سر کو بھی کاندھوں پہ اُٹھایا ہوا ہے
جسم کو جس نے مشقت پہ لگایا ہوا ہے

اپنے دہلیز پہ اک پیڑ کا سایہ ہوا ہے
مجھ کو ہر لحہ گماں ہے کوئی آیا ہوا ہے

دل سے بڑھ کر کوئی محبوب نہیں دنیا میں
ہر کسی نے اسے سینے سے لگایا ہوا ہے

شعر پر تیری خموشی سے گلہ کوئی نہیں
میں نے دیوار کو بھی حال سنایا ہوا ہے

میری وحشت پہ وہی شخص مبارک دے گا
جس نے بھی ہجر کا تہوار منایا ہوا ہے

کوئی پڑھتا ہے مرے شعر تو رو دیتا ہوں
میرا لکھا ہی مرے سامنے آیا ہوا ہے

یہ جو صف بستہ ہیں دیوار کے مارے ہوئے لوگ
ایک در نے انھیں دیوار بنایا ہوا ہے

ناتوانی نے عطا کی ہے یہ ثابت قدمی
دیر سے پاؤں جو مٹی پہ جمایا ہوا ہے

ذائقہ صبر کا ہم سے کوئی پوچھے ذیشان
زندگی بھر میں یہ اک پھل ہی تو کھایا ہوا ہے

ذیشان اطہر

لے لے کوئی ہم سے سخن آرائی ہماری
ہوتی ہے بہت صرف توانائی ہماری

سب تکتے رہے راہ تماشائی ہماری
افسوس کہ باری ہی نہیں آئی ہماری

یہ مسئلہ نور و بشر پاس رکھ اپنے
تجھ سے کوئی تکرار نہیں بھائی ہماری

منظر کو اگر چاہیں تو ہم چیر کے رکھ دیں
چاقو کی طرح تیز ہے بینائی ہماری

تالاب ہیں ہم ہجر کی یخ بستہ رُتوں کے
سب آنکھیں چاٹ گئی کائی ہماری

بس ہونٹ ہلانے کی سزا دیجیے صاحب
گویائی ہماری نہیں گویائی ہماری

افضل خان

چونک اُٹھتے ہیں ہر آہٹ پہ ڈرے رہتے ہیں
لوگ اب چین کی نیندوں سے پرے رہتے ہیں

روز و شب اُلٹے بنا رکھے ہیں ہم لوگوں نے
رات بھر جاگتے ہیں دن میں مرے رہتے ہیں

اپنی قسمت کے شجر سارے خزاں کی زد میں
اس کی تقدیر کے سب پیڑ ہرے رہتے ہیں

یہ حقیقت ہے زمیں کب کی فنا ہو جاتی
اس کا مطلب یہاں کچھ لوگ کھرے رہتے ہیں

جب تلک کُن نہ کہے مالکِ برحق تحریر
سوچ کے طاق پہ منصوبے دھرے رہتے ہیں

تحریر جاوید

خوشبوؤں میں اسے ہم کلام جانتے ہیں
وہ یوں کہ ہجر کا صوتی نظام جانتے ہیں

جس اہتمام سے ہے تو گریز پا ہم سے
ترے گریز کا ہم اہتمام جانتے ہیں

میں دشمنوں سے بھی نفرت نبھا نہیں سکتا
سو مجھ برے کو بھی نیک نام جانتے ہیں

اگرچہ غیر مقلد ہیں ہم محبت کے
مگر دلوں کو دکھانا حرام جانتے ہیں

ہمارے پاؤں کے تلووں میں چبھ گئے رستے
سو اب ٹھہرنے کو ہم کب قیام جانتے ہیں

عاطف نصیر

دوش پر بوجھ دھرا آپ جہاں بانی کا
ہم نے احسان اُٹھایا نہیں آسانی کا

تجھ کو ٹھکرا کے ہر اک شخص چلا جاتا ہے
زندگی رنج بہت ہے تری ارزانی کا

اب یہ سوچا ہے کہ اس پر نہیں سوچا کرنا
عقدہ کھلنے کا نہیں فطرتِ انسانی کا

جانے کس دشت میں اب خاک اُڑاتی ہے ہوا
جانے اس شہر میں کیا جاتا ہے مرجانی کا

دل کو مت کھینچ محبت کی رعایت سے عبید
ایک ہی چارہ ہے یہ دل کی پریشانی کا

عبید اللہ نزاکت

رستہ کوئی دیوار میں ہو در کے علاوہ
جاؤں گا کدھر بھاگ کے میں گھر کے علاوہ
ہاتھوں میں تھا جو کچھ بھی گیا میل کی صورت
پاؤں میں پڑا کچھ بھی نہیں سر کے علاوہ
سائے کی طرح ساتھ مرے رختِ سفر میں
آسیب کوئی اور بھی ہے ڈر کے علاوہ
پگھلایا جسے دل نے بہت موم کی صورت
کچھ بھی تو نہیں نکلا ہے پتھر کے علاوہ
اس جنگ میں ہارا ہوں جہاں میرے مقابل
کوئی بھی نہیں تھا مرے لشکر کے علاوہ
کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دیتی
ہے شور کہاں یہ مرے اندر کے علاوہ
اک خوف بلاخیز ہے یہ سیل رواں بھی
میں آنکھ سے ڈرتا ہوں سمندر کے علاوہ
مسعودؔ اسی نے تو مجھے دھوکا دیا ہے
سب کچھ تھا مرے پاس مقدر کے علاوہ

مسعود احمد

---

اس تو دستار بچانی ہے یہ سر دینا ہے
چاہے جو کچھ بھی اجاڑ یہ کر دینا ہے
ایک مدت سے جنوں دشت میں ہے خانہ بدوش
اب تو اس بے سر و سامان کو گھر دینا ہے
دل نے کچھ بے سر و سامانیاں رکھی ہوئی ہیں
رہروِ عشق کو یہ رختِ سفر دینا ہے
بوڑھے برگد کے بھی کٹنے کا بہت دکھ ہے مجھے
ڈھونڈ کے اُجڑے پرندوں کو بھی گھر دینا ہے

میری جلتے ہوئے سورج سے عداوت تو نہیں
میں نے تپتے ہوئے صحرا کو شجر دینا ہے
ظلمتوں سے مرا سمجھوتا نہیں ہو سکتا
اب شبِ تار کو مطلعِ سحر دینا ہے
جرمِ اُلفت کا سزاوار میں ٹھہرا ہوں جلیل
آپ بھی دیں کوئی الزام اگر دینا ہے

احمد جلیل

---

جب بھی مجبوری پڑی یار چلا جائے گا
مرا جینا یونہی بے کار چلا جائے گا
بس یہی خوف لگا رہتا ہے ہر پل مجھ کو
میں ہوں اس پار وہ اس پار چلا جائے گا
مجھ سے لڑنے تو ضرور آئے گا دشمن میرا
رکھ کے قدموں میں وہ تلوار چلا جائے گا
کیا یہ سچ ہے کہ یہ لمحے بھی فسانہ ہوں گے
کیا یہ سچ ہے کہ مرا یار چلا جائے گا
جہاں تک میری کہانی یہ مکمل ہوگی
وہاں تک ہی ترا کردار چلا جائے گا
اُس کو شہزادی نہ اس پار ملی تو اشعر
اب کہ شہزادہ ہی اُس پار چلا جائے گا

افتخار اشعر

---

غم کا دریا بپھرا کیسے
تیرا چہرہ اُترا کیسے
کس کو دیکھا سپنوں میں جو
جُوڑا تیرا بکھرا کیسے
دل پر نظروں کا پہرہ تھا
پھر وہ باہر نکلا کیسے
پہلے دن سے دل بنجر تھا
آنکھ سے چشمہ پھوٹا کیسے
آئی یہ تبدیلی کیسی
گھر کا رستہ بھولا کیسے
ہر دم لب پر رہنے والا
نغمہ بھولا بسرا کیسے
میری باتیں سن کر دیکھو
حیرت سے وہ چونکا کیسے
نازؔ ترا وہ تھا ہی کب سے
تم نے اس کا سوچا کیسے

ناز اوکاڑوی

---


شہر میں آ کر پڑھنے والے بھول گئے
کس کی ماں نے کتنا زیور بیچا تھا
ممتاز شاعر اسلم کولسری کا تازہ شعری مجموعہ
"کیف"
غزلیں، نظمیں، گیت اور سیکنڈے نیوین شاعری کے تراجم
فلیپ سید ضمیر جعفری، ڈاکٹر طارق عزیز
ناشر
مکتبہ تعمیر انسانیت
الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور

## جہاں تم ہو

جہاں تم ہو!
وہیں پر خواب ہے میرا
کہ جس میں ایک ان دیکھا
زمانہ سانس لیتا ہے
کوئی اُمید کونپل کی طرح سے
لہلہاتی ہے
کسی خاموش لمحے میں
تمہارے لمس کو محسوس کرتی ہے
دیے کی لو کی صورت ٹمٹماتی ہے
مری آنکھوں میں اُبھری
آرزو کا عکس بنتی ہے
سمٹتی ہے، بکھرتی ہے
جہاں تم ہو!
وہاں پر حرف و معنی اک نئے
منظر کا حصہ ہیں
کہ جس منظر میں وہ عہدِ تمنا ہے
جسے کھو کر
کئی صدیوں سے میں
اندھی مسافت کی کہانی ہوں

ارشد نعیم

---

دریائے لامکاں کی روانی میں عشق ہے
پانی تھا سب سے پہلے، سو پانی میں عشق ہے
تخلیق دو جہاں کا سبب اور کچھ نہیں
اک لفظ کن کی ساری کہانی میں عشق ہے
قربان یونہی کرتے نہیں لوگ جان و دل
مولا! تری ہر ایک نشانی میں عشق ہے
واری تمہاری پیاس کے تسنیم و سلسبیل
پیاسو تمہاری تشنہ دہانی میں عشق ہے
خوشبو کے پھیلنے کا سبب اور کچھ نہیں
گر غور کیجیے رات کی رانی میں عشق ہے
مجھ کو سمجھ سکیں گے کہاں یہ زمانہ ساز
میرے قلم میں، حرف و معانی میں عشق ہے
گھر سے نکل پڑے ہیں یہ ہم کس کی چاہ میں
اشرفؔ ہماری نقل مکانی میں عشق ہے

اشرف نقوی

---

رہ خبر کہ مقامِ نظر اضافی ہے
مرے ہے تو یہ سارا سفر اضافی ہے
ہم اپنے گھر میں بھی اک اجنبی سے بڑھ کے نہیں
سو ایک وہم ہے ورنہ یہ گھر اضافی ہے
جو پہلی بار بنایا گیا وہی میں تھا
جو بن رہا ہوں میں بارِ دگر اضافی ہے
ورائے فہم ہے جھگڑا بلیس و یزداں کا
اور اس فسانے میں مجھ سا بشر اضافی ہے
ہمارے بعد ہمارا ہنر تعارف ہے
ہمارے بعد ہنر اضافی ہے
میں خیر و شر سے کہیں دور لے چلوں گا تجھے
کہیں تو فرق چراغ و شرر اضافی ہے
وہ مے جو صدیوں سے واعظ پلا رہے ہیں ہمیں
ادھر ضروری تھی صاحب اُدھر اضافی ہے
میں دھوپ اوڑھ کے بیٹھا ہوں باغ میں آصفؔ
اک ایسا باغ کہ جس میں شجر اضافی ہے

علی آصف

---

کیوں نہ اب عشق میں تسکین ملا کر دیکھیں
آج سوچیں نہ اُسے آج تو جا کر دیکھیں
ابر کہتا ہے کہ برسے گا اُسی موسم میں
آؤ اُس موسم گریہ کو بلا کر دیکھیں
یہ تو اب اُس پہ ہے کب اُس کو فراغت ہوگی
کیا بھلا روز اُسے یاد دلا کر دیکھیں
عشق نے ہم کو تو آداب سکھائے ہوئے ہیں
کیسے ممکن ہے تجھے آنکھ اُٹھا کر دیکھیں
کیسے محسوس کریں حُسن کو چھو کر عزتؔ
اپنے ہاتھوں سے وہی نقش بنا کر دیکھیں

عزت مآب

# بہاولنگر

کرتی ہے روز مجھ کو مسلمان تیری یاد
فتوے ملے نہیں ابھی الحاد کے مجھے
مٹھی میں بخت رہ گیا اور اونگھتے گلاب
شہزادیاں چلی گئیں، شہزاد کے مجھے
میں انتقام لے سکوں معصوم گردنو!
بازو نہیں ملے ابھی فولاد کے مجھے
خوشبو کو پارچوں میں سیا آنکھ لگ گئی
آئینے دیکھتے رہے جلاد کے مجھے
خنجر بلا رہے ہیں کسی کند رات کے
دسکی کی پلکوں میں چھپی یاد کے مجھے
لکھنا ہے تیرا نام طلائی حروف سے
بچے نکالتے ہوئے اعداد کے مجھے
ناطق کہاں چھپاؤ گے یاقوت کے ورق
لے جا رہے ہیں ابرو ہوا لاد کے مجھے
عامر میں کہکشاں پہ کہیں راکھ ہو گیا
آنسو بنا رہے ہیں پری زاد کے مجھے
لیکن اُس آب زرد کو دیکھا نہیں؟ گیا

عامر سہیل

اک چاندنی کے عکس میں اُترا نہیں گیا
کچھ خلوتوں میں نیند سا آیا، نہیں گیا
جلتی رہی تھی آنکھ میں صدیوں کی بے بسی
اُمید کا ادھر کوئی جھونکا نہیں گیا
تاروں کو دیکھتے ہوئے راتیں پلٹ دیں
سورج سے روشنائی کا قطرہ نہیں گیا

ساحل کی بندشوں میں تمہاری بے رونقی
پانی کے آسمان سے رویا نہیں گیا
یادوں کے پھول سوچ کا گلدان سے گیا
خشکی سا ریت آشنا دریا نہیں گیا
راہوں کے جسم ڈھول کے آنسو سمیٹنے
کوئی حنائے درد سے ڈھانپا نہیں گیا
بزمِ محبت ایسے سجائی تھی لوگوں میں
ہاتھوں سے میرے خواب کا سایہ نہیں گیا
آیا تھا ایک دوست بھی رنگوں کا ہم سفر
جانے لگا تو ہم نے بھی روکا نہیں، گیا
قلموں سے اُگ رہی ہیں نئی شاخیں سُو بہ سُو
چہرہ کسی بھی گل میں تمہارا نہیں گیا
تکیہ لگا کے بیٹھ گئی رات آج بھی
سینہ پہاڑیوں سے سہارا نہیں گیا
عمرِ مصور لب فطرت پہ رائگاں
اس شاہکار کو کبھی دیکھا نہیں گیا
اتنے سویرے گھر مرے یہ میزبانیاں!
ماہِ رخِ بہار سے آیا نہیں گیا
ویرانی جہان کا کھلنا بھی مہر تھا
ایسے میں دل سے یار کا چہرہ نہیں گیا
بادل ہوا کے گال پہ ہونٹوں سے چومتے
لیکن اُس آب زرد کو دیکھا نہیں؟ گیا

احمد علی کیفؔ

فرقت کے ماہ و سال سے وحشت نہیں رہی
اب تو مجھے کسی کی ضرورت نہیں رہی
یا اُن سے یہ کہو کہ ابھی وقت ہی نہیں
یا اُن سے یہ کہو کہ محبت نہیں رہی
چلتا ہوں میں ہواؤں کی پلکوں پہ اس طرح
جیسے زمینِ یار سے رغبت نہیں رہی
کس زاویے سے ہے ترا چہرہ چھپا ہوا
اے زندگی! تُو اب تو بجھارت نہیں رہی
میں اپنی کہکشاں میں ہی خود ہو گیا ہوں گم
مجھ کو کسی راہ سے نسبت نہیں رہی
پہلی سی خوش خرامیاں نقوی مگر کہاں
اب جذبۂ جنوں میں وہ شدت نہیں رہی

سیّد علی عمران نقوی

ریت ، سمندر ، تنہائی
آیا نہ تُو ہرجائی
سانس چلے بن کے خنجر
جان لبوں پر آج آئی
یاد آنے پر رہتا ہوں
آنکھ رہے نہ پتھرائی
آس کے دریا خالی ہیں
نیند بھی اُجلی زخمائی
شیخ ایوب کے آنگن میں
تنہائی ہے تنہائی

شیخ ایوب آسی

# ننکانہ صاحب

حد سے گزر کے حد کا تعین کیا نہ کر
ہے کون نیک و بد کا تعین کیا نہ کر
ہم نے بھی کچھ تو ایسا غلط بھی کیا نہیں
بے شک نہ مان رد کا تعین کیا نہ کر
چہرے کو دیکھ کر نہ کسی ذات کو پرکھ
ادنیٰ یا اعلیٰ حد کا تعین کیا نہ کر
ہوتے ہیں اونچے قد کے بھی کچھ بونے لوگ یاں
قد دیکھ کر تو قد کا تعین کیا نہ کر
کب تیرے اختیار میں کچھ ہے جہان کا
تو ناپ تول حد کا تعین کیا نہ کر
سب کچھ خدا کے ہاتھ ہے اچھا برا کرے
شاہد تو رشک حسد کا تعین کیا نہ کر

عبدالرشید شاہد

اشک مجھ پہ ہی جو چھلکا ہے نچھاور کر دو
میں جو صحرا ہوں مجھے رشکِ سمندر کر دو
میری آنکھوں کو نہ دکھلاؤ سسکتے منظر
یا مرا دل جو دھڑکتا ہے یہ پتھر کر دو
میں وفاؤں کا پجاری ہوں، مجھے ڈر کیا ہے؟
تم جفا پیشہ اگر چاہو تو محشر کر دو
بس مری اندھی عقیدت کا بھرم رہ جائے
تم خدا ہو یا صنم، خود کو اُجاگر کر دو
قید تنہائی تو شائق نے بہت کاٹی ہے
وقت ملنے کا کوئی اب تو مقرر کر دو

فرزند شائق

یہ آرزو ہے کہ اب کوئی آرزو نہ کریں
کسی خیال سے قلب و جگر لہو نہ کریں
اگرچہ چاک ہے تو اس کو چاک رہنے دیں
ہم اپنے دامن دل کو بھی اب رفو نہ کریں
سخنوری کا بھرم اس طرح سے بھی رکھیں
کہ اپنے آپ سے ہی کوئی گفتگو نہ کریں
ہر ایک حرف ہو بے باک بے لباس نہ ہو
اے عندلیب تجھے گل کے روبرو نہ کریں
ہم اپنی تشنہ لبی کے خمار میں گم ہیں
مئے فراق سے خالی ابھی سبو نہ کریں
کسی طرح سے بھی موزوں نہیں ہمارے لیے
چھپا ہوا ہے اگر وہ تو جستجو نہ کریں
سنا ہے آج فلک بھی کرم پہ مائل ہے
کہو رؤف پھر اشکوں سے اب وضو نہ کریں

عبدالرؤف شاہ

## ماں

کرم کے جیسے قدم ہیں یہ تیرے
کہ جن کی گردِ سفر نے بخشا
مرے مقدر کو اذنِ حاصل
انہی کے انتھک عمل سے میرے
وجودِ ہستی کے ارتقا نے
بھرم کا رستہ کیا مکمل
کبھی نقشوں کا مان تجھ سے
محبتوں کی دعا بھی تو ہے
تری نگاہوں سے خیر پھوٹے
سخاوتوں کی عطا بھی تو ہے

پروفیسر عمیر علی واصف

تجھ سا ترا خیال مرے ساتھ ساتھ تھا
شہرِ شبِ وصال مرے ساتھ ساتھ تھا
میں کون تھا کہاں تھا مجھے کچھ خبر نہ تھی
از بس کہ اک سوال مرے ساتھ ساتھ تھا
شب زاد تیرے شہر میں آنے سے پیشتر
وحشت کا اک وبال مرے ساتھ ساتھ تھا
واں دشت زندگی میں زمانوں کی ریت پر
غم کیچوے کی چال مرے ساتھ ساتھ تھا
پھیلی ہوئی تھی دور تلک نکہتوں کی باس
اُس پل مہ شوال مرے ساتھ ساتھ تھا
وہ درد جس نے موت کا دم سرد کر دیا
زاہد وہ کتنے سال مرے ساتھ ساتھ تھا

چودھری محمد انور زاہد

# ٹیکسلا

چلو تم کو ملاتا ہوں میں اس مہمان سے پہلے
جو میرے جسم میں رہتا تھا میری جان سے پہلے
کوئی خاموش ہو جائے تو اس کی خامشی سے ڈر
سمندر چپ ہی رہتا ہے کسی طوفان سے پہلے
مجھے جی بھر کے اپنی موت کو تو دیکھ لینے دو
نکل جائے نہ میری جاں مرے ارمان سے پہلے
مری آنکھوں میں آئی موتیوں کا سلسلہ دیکھو
کہ سو تسبیح کرتا ہوں میں اک مسکان سے پہلے
پرانا یار ہوں دوشی مرا یہ فرض بنتا ہے
تجھے ہشیار کر دوں میں ترے نقصان سے پہلے

عبدالرشید شاہد

---

تو بھٹک نہ یوں ہی ادھر ادھر ذرا غور کر
ترے پاس ہے ترا چارہ گر ذرا غور کر
اسے غفلتوں میں نہ کر بسر ذرا غور کر
ہے یہ زندگی بڑی مختصر ذرا غور کر
ذرا غور کر مرے حال پر مرے چارہ گر
مرے چارہ گر مرے حال پر ذرا غور کر
یونہی دستکوں پہ نہ دستکیں دیے جا یہاں
ترے سامنے ہے یہ قفل در ذرا غور کر
تجھے راستے میں سکوں ملے مری چھاؤں سے
تری رہ گزر پہ ہوں میں شجر ذرا غور کر

نوشیروان عادل

---

درد کا انتساب جانتے ہو
تشنگی میں سراب جانتے ہو
کیسے آتی ہے نیند آنکھوں میں
کیسے آتے ہیں خواب جانتے ہو
جانتے ہو مرے سکوں کو مگر
کیا مرا اضطراب جانتے ہو
چاہتے ہو کہ جان لو سب کچھ
آگہی کا عذاب جانتے ہو
تم مرے قہقہے تو گن لو گے
آنسوؤں کا حساب جانتے ہو

حسن علی طاہر

---

ہے زمیں تک یا آسماں تک ہے
جانے میرا سفر کہاں تک ہے
ہے مکمل ہماری تیاری
دیر بس آپ کے بیاں تک ہے
بال و پر بھی مرے کٹے ہوئے ہیں
اور اڑنا بھی کہکشاں تک ہے
ہم نے جو کچھ کہا حقیقت ہے
جان حاضر ہماری جاں تک ہے
اس کو دنیا پہ مت عیاں کرنا
راز جو اپنے درمیاں تک ہے
صرف دل ہی جدا نہیں سب سے
منفرد اپنی داستاں تک ہے

---

پھول اک چاہیے مجھے جابرؔ
بس یہی کام باغباں تک ہے

جابر نظامی

---

دکھ میں رونا اور خوشی میں ہنسنا یاد نہ آئے
اُس سے کہو وہ یاد آئے پر اتنا یاد نہ آئے
روز چلی آتی ہے ملنے مجھ سے ایک مصیبت
آج تو اُس کو میرے گھر کا رستہ یاد نہ آئے
اس دن کو میں اس جیون میں کیسے شامل کر لوں
جس دن اُس کی باتیں اُس کا چہرہ یاد نہ آئے
دل کو اپنوں کی باتوں سے اتنے دکھ پہنچے ہیں
شاید مر کر بھی اب کوئی اپنا یاد نہ آئے
کیسے ممکن ہے یہ آنکھیں ہوں اشکوں سے خالی
کیسے ممکن ہے وہ جانے والا یاد نہ آئے
اُس میں اتنا گم ہو جاتی ہوں میں بیٹھے بیٹھے
کبھی کبھی تو نام بھی مجھ کو اپنا یاد نہ آئے
جن پیڑوں کے نیچے گزری اپنی عمر شکیلہؔ
کیسے ممکن ہے کہ اُن کا سایا یاد نہ آئے

شکیلہ ستارہ

## سلام امام حسینؑ

یا حسینؑ ابن علیؑ اے بے وطن تجھ کو سلام
اے نواسۂ نبیؐ اے بے وطن تجھ کو سلام
کربلا کی ریت میں شامل ہوا تیرا لہو
کہہ اٹھی ذات جلی اے بے وطن تجھ کو سلام
جان دینے کے لیے گھر چھوڑ کر تو چل پڑا
اے محمدؐ کے وصی اے بے وطن تجھ کو سلام
ہر بشر کو مل رہی ہے روشنی وہ رات کی
جو ترے خوں سے ملی اے بے وطن تجھ کو سلام
دیکھ کر سجدہ تیرا سب انبیاء کہنے لگے
سب خدائی کہہ اٹھی اے بے وطن تجھ کو سلام
ذرہ ذرہ اس جہاں کا رو کے یہ کہنے لگا
اے امامِ متقی اے بے وطن تجھ کو سلام
خشک مٹی تر ہوئی سرکار تیرے خون سے
خاک بھی کہنے لگی اے بے وطن تجھ کو سلام
زیرِ خنجر کربلا میں دیکھ کر سجدہ تیرا
موت بھی کہتی رہی اے بے وطن تجھ کو سلام
سر رکھا مقبولؔ سجدے میں اٹھایا پھر نہیں
لاج مُرسل کی رکھی اے بے وطن تجھ کو سلام

مقبول ذکی مقبول

---

باغ کو دیکھ مچا دیتے ہیں اکثر دھوم پرندے
طوفانوں کا کیسے سمجھیں گے مفہوم پرندے
تنہائی کی قید میں زندہ رہنا کتنا مشکل
قفس میں آخر مر جاتے ہیں کچھ محکوم پرندے
فلک کو چھونے کا مضبوط ارادہ باندھ رہے ہیں
مسجد کے مینار پہ بیٹھے نامعلوم پرندے
کھیتی کھیتی ڈالی ڈالی ظلم کے جال بچھے ہیں
ایسی باتیں کیسے جانیں یہ مظلوم پرندے
ظالم کے مذموم مقاصد خاک میں مل گئے آخر
سانپ کو دیکھ کے یکجا ہو گئے سب معصوم پرندے

علی شاہ

---

کیسے کیسے خواب دکھائے جاتے ہیں
پانی پر بھی پیڑ اُگائے جاتے ہیں
اس جانب اشکوں کی فصلیں اُگتی ہیں
جس جانب کو غم کے سائے جاتے ہیں
اب سمجھا ہوں دل کے مخفی خانوں کو
ان کے اندر درد چھپائے جاتے ہیں
جیسے مجھ کو پہرے میں لے آئے ہو
ایسے جیل میں قیدی لائے جاتے ہیں
لڑتے ہیں وہ شب بھر تیز ہواؤں سے
ٹیلوں پر جو دیپ جلائے جاتے ہیں
آج کسی کی آمد بھی ہو سکتی ہے
آج فلک پر بادل چھائے جاتے ہیں
جانتے ہیں کہ رستہ سارا دلدل ہے
پھر بھی ہم رفتار بڑھائے جاتے ہیں
پہلے دشت میں دانش ایسا ہوتا تھا
اب گلیوں میں جال بچھائے جاتے ہیں

جاوید دانش

---

اب نہ وہ دل نہ وہ دماغ رہا
دل دامن میں صرف داغ رہا
اب وہ بلبل نہ گُو، وہ کوئل کی
وہ نہ مالی رہے نہ باغ رہا
مے تھی مے خار اور ساقی تھا
پھر بھی تشنہ مرا اَیاغ رہا
دونوں جلتے رہے ہیں فرقت میں
راہ پر آنکھ اور چراغ رہا
اُس نے جب سے کہا ہے بالم جی
دل اُسی دن سے باغ باغ رہا

اقبال بالم

---

میں پڑا ہوں اک ایسے چاہ کے بیچ
جو نہیں قافلے کی راہ کے بیچ
ختم ہے صنعتِ تضاد اُس پر
نور ہے جامۂ سیاہ کے بیچ
ذہن ہے گویا عرصۂ جنگاہ
اور بھگدڑ سی ہے سپاہ کے بیچ
عامۃ الناس کی خدایا خیر
ٹھن گئی شاہزاد و شاہ کے بیچ

سلیم گورمانی

# متفرق شاعری

رابطہ ہے ابھی ہواؤں سے
جی رہا ہوں تری دعاؤں سے
زندگی! بول کیا ارادہ ہے
موت مہنگی نہیں دواؤں سے
تو مری لغزشوں پہ طنز نہ کر
میری پہچان ہے خطاؤں سے
اس کو کہتے ہیں ہم زمیں کی کشش
لوٹ آیا بشر خلاؤں سے
اے خدا! اب تو بال و پر دے دے
جسم چھپتے نہیں قباؤں سے
جرم بھی بے حساب کرتے ہیں
بچ بھی جاتے ہیں وہ سزاؤں سے
رنج و غم ہوں کہ حسرت و ارماں
مطمئن ہوں تری عطاؤں سے
جتنے خانہ خراب ہیں سب کو
بددعائیں ملی ہیں ماؤں سے
کوششیں چھوڑ دوں بھی نصرت
کام نکلیں اگر دعاؤں سے

نصرت صدیقی/فیصل آباد

ہم نے سمجھا انہیں معتبر عمر بھر
غم بڑھاتے رہے چارہ گر عمر بھر
کچھ ستارہ شناسی بھی کام آ گئی
رائیگاں تھا وگرنہ سفر عمر بھر
بس گھڑی دو گھڑی کوئی مہماں رہا
جگمگاتے رہے بام و در عمر بھر
نام اُس کا مرے خیر خواہوں میں ہے
وہ جو مجھ سے رہا بے خبر عمر بھر
گام دو گام تھا ہم سفر وہ مرا
پھر مہکتی رہی رہ گزر عمر بھر

حجاب عباسی/کراچی

دل سے اک یاد بھلا دی گئی ہے
کسی غفلت کی سزا دی گئی ہے
عیب دیوار کے ہوں گے ظاہر
میری تصویر ہٹا دی گئی ہے
میں نے منزل کی دعا مانگی تھی
میری رفتار بڑھا دی گئی ہے
اس لیے جم کے یہاں بیٹھا ہوں
مجھ کو میری ہی جگہ دی گئی ہے
اب محبت کا سبب ہے وحشت
ورنہ حسرت تو مٹا دی گئی ہے

محمد ندیم بھابھہ

دن ڈھلا شام ہوئی اور ملی رات کے ساتھ
پھر تیرا ذکر چلا بات چلی بات کے ساتھ
وصل کی رات تھی اور بھیگ رہا تھا آنچل
تیری آنکھوں سے برستی ہوئی برسات کے ساتھ
کارِ دنیا سے مجھے کچھ بھی نہیں ہے مطلب
میں کہ منسوب ہوئی جب سے تیری ذات کے ساتھ
میری ہر سوچ ہر اک آس بندھی ہے تم سے
کیوں بدل جاتے ہو تم صورتِ حالات کے ساتھ
پاس رہ کر بھی کوئی پاس نہیں ہوتا
یہ خلش بڑھتی ہے ہر ایک ملاقات کے ساتھ
ایک سے ایک ہنر دادِ طلب ہے میرا
اور بھی حوصلہ بڑھتا ہے نئی مات کے ساتھ
حُسن کی میں نے کئی بار غلامی دیکھی
لوگ دولت سے بہت کھیلے ہیں جذبات کے ساتھ
کیوں میرے دکھ پہ ہو حیراں و پریشاں میرے دوست
یہ تو ورثے میں چلا آیا ہے سادات کے ساتھ
زرد موسم میں تیرا ساتھ بھی کچھ ایسا ہے
شاخ کا جیسے تعلق ہو کسی پات کے ساتھ

گلفام نقوی

راہِ پُرخار، ترے خار، مری زندگی ہیں
یہ جو ہیں رنج، دلِ زار، مری زندگی ہیں
جانتا ہوں کہ اُنھیں مجھ سے نہیں کوئی غرض
پھر بھی سب دوست، مرے یار، مری زندگی ہیں
میں کہانی میں فقط ہوں پسِ منظر کی طرح
لیکن اس میں ہیں جو کردار مری زندگی ہیں
جو بھی فطرت کے مظاہر ہیں مرے اپنے ہیں
وہ پرندے ہوں کہ اشجار مری زندگی ہیں
میں محبت ہوں ہر اک دور میں جینا ہے مجھے
جو بھی ہیں میرے گرفتار مری زندگی ہیں
اے شبستانِ غمِ ہجر تجھے کیا معلوم
یہ جو ہیں صبح کے آثار، مری زندگی ہیں

محمد عدنان خالد

# متفرق شاعری

کون کہتا ہے تجھ پہ مرتا ہوں
میں تو رسماً سلام کرتا ہوں
بدگمانی کی اتنی پھسلن ہے
راستوں پہ سنبھل کے چلتا ہوں
کچھ تو بدلا ہے موسموں نے لباس
اور کچھ میں اُداس رہتا ہوں
دل کے جذبوں سے مصلحت کیسی
میں اصولوں کی جنگ لڑتا ہوں
مُدعا میرے دل کا ہے اتنا
اُن کے آنچل سے پیار کرتا ہوں
اُن کی آنکھوں میں ڈوب کر عثمانؔ
ساحلوں کے لیے مچلتا ہوں

ڈاکٹر محمد عثمان

---

اک عجب اُداسی ہے
بے سبب اُداسی ہے
اک بلا ہے زندگی
روز و شب اُداسی ہے
قہقہے بلند ہیں
زیرِ لب اُداسی ہے
تو مری خوشی تھا کل
تو بھی اب اُداسی ہے
جو بھی کچھ یہاں یہ ہے
سب کا سب اُداسی ہے
حسن یاد ہے کمال
کیا غضب اُداسی ہے
مر نہ جاؤں میں کہیں
ایسی اب اُداسی ہے

نیازت علی نیازؔ

---

دُنیا کہتی رہے وہ جھوٹا ہے
ہاں مگر، میرا پیار سچا ہے
اپنی باتیں تو چُھپا سکتی تھی
بس اُسی نے یہ بھید کھولا ہے
چاند جیسا ہے وہ تو اُس کے لیے
پھول سب سے حسین تحفہ ہے
اب بھی بچوں سے کھیلتا ہے بہت
دل کو میں نے گلی سے ڈھونڈا ہے
اُڑنے لگتا ہے چھوڑتا ہوں تو
ہو نہ ہو یہ پری کا جھمکا ہے
دُکھ سمندر میں ڈال آتا ہوں
دُکھ کوئی بھی ہو جان لیوا ہے
اس کی تاثیر مر نہیں سکتی
پیار تو شہد سے بھی میٹھا ہے
شمسؔ کیوں نہ میں ربّ سے لاڈ کروں
ربّ تو ماں سے بھی زیادہ اچھا ہے

زاہد شمس/ملتان

---

مری بستی میں کب بدلے گا یہ اُفتاد کا موسم
سدا مغموم رہتا ہے دلِ ناشاد کا موسم
پرندے کو فضا میں چہچہانا یاد ہے اب تک
قفس میں رات دن آئے نظر صیّاد کا موسم
مرے غم کی کہانی پر کبھی اصرار مت کرنا
نمی آنکھوں میں لائے گا مری روداد کا موسم
اسی اُمید پر بیٹھا ہوا ہے پھر سے فریادی
سنا تھا آنے والا ہے ابھی فریاد کا موسم
جسے کشکول میں گرتے ہوئے سکّوں سے اُلفت ہو
کبھی بدلا نہیں اُس قوم پر امداد کا موسم
مرے پاؤں سے بیڑی کی صدا جب کان تک آئے
مجھے ایسا لگا اب آ گیا فولاد کا موسم
جہاں پہ سانس لینے پر کوئی پہرہ نہ ہو صابرؔ
مری فطرت میں ہے اس خطۂ آزاد کا موسم

محمد ایوب صابر/سیالکوٹ

---

یہ دھند میں لپٹی سرد شامیں
خزاں رسیدہ یہ زرد شامیں
کہاں کہاں لے کے پھر رہی ہیں
مجھے یہ آوارہ گرد شامیں
کہیں سے رستے میں آ گئی ہیں
عجیب صحرا نورد شامیں
نہ میری تنہائیوں کو سمجھیں
نہ جان ہی پائیں درد شامیں
یہ کس نے آنگن میں پھینک دی ہیں
غبار سمجھیں یہ گرد شامیں
اُفق پہ کس کا لہو ہے طارقؔ
یہ کس کے غم میں ہیں زرد شامیں

طارق جاوید/مانسہرہ

# تبصرۂ کتب/فلیپ/آراء

نام کتاب: فصیح نعتیں/ انتخاب: ریاض ندیم نیازی/صفحات 176 / قیمت :250 / رائے: سید فصیح الدین سہروردی

---

برادر محترم ریاض ندیم نیازی نے نعت گوئی اور نعت خوانی کے آداب میرے والد گرامی حضرت علامہ سید محمد ریاض الدین سہروردیؒ سے ہی سیکھے ہیں۔ نیازی صاحب نے میری پڑھی ہوئی نعتوں پر مشتمل ایک نعتیہ کتاب ''فصیح نعت'' کے نام سے مرتب کی ہے جس میں منتخب شعرا کی لکھی ہوئی منتخب نعتیں شامل ہیں اور یہ ایک ہدیہ عقیدت ہے بحضور سرورِ کائنات حضرت محمد ﷺ کی بارگاہِ اقدس میں۔ اللہ تعالیٰ ریاض ندیم نیازی کی اس سعی جمیلہ کو اپنی بارگاہ میں اور نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہ میں شرفِ قبولیت عطا فرمائے۔ آمین

ریاض ندیم نیازی ایک کہنہ مشق شاعر، ادیب، صحافی اور انتہائی ملنسار شخصیت کے حامل ہیں۔ میری ان سے شناسائی کا حوالہ سرکارِ دو عالم ﷺ کی نعت شریف ہے۔ اس حوالے سے بڑھ کر کوئی اور حوالہ ہو ہی نہیں سکتا۔ میں ہمہ وقت ان کے لیے دُعا گو ہوں۔

نام کتاب: سراب یورپ/ مصنف: عظمت نصیب/صفحات 192 / قیمت :400

---

عظمت نصیب گزشتہ چودہ برس سے فرانس کے شہر پیرس میں مقیم ہیں۔ ان کی پنجابی شاعری کی کتاب ''بول نہ مردے'' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ زیرِ نظر اُردو کہانیوں کی کتاب خوش آئند ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے قلم میں پنجابی نثر اور شاعری کے ساتھ ساتھ اُردو نثر لکھنے کی بھی صلاحیت موجود ہے۔ اُن کی پنجابی شاعری، اُردو نثر اور اُردو نظم کی مزید کتابیں بھی تکمیل کے مراحل میں ہیں۔

نام کتاب: سوزِ دل/ انتخاب: حمید اللہ حمیدی/صفحات 200 / قیمت :400

---

''سوزِ دل'' حمید اللہ حمیدی کے افسانوں کی پہلی تصنیف ہے اس سے قبل روحانیت و نفسیات پر ان کی کتاب ''سکونِ دل'' شائع ہو چکی ہے۔ قلم و کتاب سے بے پناہ محبت کرنے والے مصنف نے سکول و کالج اور کوٹلی لوہاراں کی لائبریری کے علاوہ کراچی اقبال لائبریری، قطر کی نیشنل لائبریری اور ذاتی کتب خانہ سے علم کی پیاس بجھائی۔ تعلیم کے دوران ''بزمِ ادب'' اور خدمتِ خلق کی تنظیمیں قائم کیں۔ ایک نیم ادبی و سیاسی رسالے ''جائزہ'' کا اجرا کیا۔ کالج کے میگزین میں ان کی تخلیق ''یہ مزدور'' سال کا بہترین افسانہ قرار پایا۔ اخبارِ جہاں، یارانِ وطن میں افسانے، نوائے وقت میگزین میں مزاحیہ مضامین شائع ہونے کے علاوہ کراچی کے دینی رسالے میں فکری مضامین اور انگریزی اخبار میں انگریزی نظمیں چھپ چکی ہیں۔ قطر میں ایک کلب "Toast Master" کے ممبر اور ''سیالکوٹ پوسٹ'' کے معاون مدیر بھی ہیں۔ ایک عظیم لائبریری کی تعمیر (کتاب محل) ان کا خواب ہے۔ ان کے پُرسوز افسانے سماج کے نام ایک پیام اور نظام کے خلاف آواز ہیں۔ ایک بار ضرور ان کا مطالعہ کریں۔

نام کتاب: بارش میں جلتا گھر/ مصنف: عظمت فیروز شہاب/صفحات 208 / قیمت :280 / رائے: اسلم کولسری

---

''بارش میں جلتا گھر'' عظمت فیروز شہاب کا چھٹا مجموعہ کلام ہے۔ منظر جیسا بھی جاذبِ نظر کیوں نہ ہو، ٹھہراؤ اور جمود اس کی دلکشی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ شاعری کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ کوئی رنگ، روشِ عام کا درجہ اختیار کر جائے تو آہستہ آہستہ اپنے سحر سے محروم ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ وجدان کو متوجہ اور متحرک کرنے کے لیے لازم ہے کہ اس میں کوئی ندرت پیدا کی جائے۔ لہجے کے حوالے سے یا خیال آفرینی کے باب میں۔

عظمت فیروز شہاب کی شاعری میں جگہ جگہ آپ کو مدرت کے جگنو چمکتے ہوئے نظر آئیں گے۔ مجھے ان کی جس خصوصیت نے خاص طور پر متاثر کیا ہے وہ ان کی وسیع النظری ہے۔ مراد یہ کہ بعض خیالات اور موضوعات ایسے بھی ہیں جو طویل نظم کے متقاضی تھے مگر انھوں نے کمال مہارت سے انھیں دو مصرعوں میں سمو دیا کہ قاری یا سامع اس ریشم کی چھوٹی سی گتھی کو کھولتا چلا جائے اور ریشم ختم نہ ہو یا جیسے پورے محل کو مہکا دینے والا عطر چھوٹی سی شیشی میں بند کر دیا جاتا ہے۔ ان کی شاعری میں انفرادی دُکھ، تجربے اور خواب بھی سموتے ہیں۔ مگر اجتماعی معاملات کا کرب ان پر غالب دکھائی دیتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی بات اپنا تذکرہ محسوس ہوتی ہے اور ان کے محسوسات میں اپنے غموں کا تلاطم خدا کرے وہ یوں ہی شاعری کے چمن میں ہمارے لیے گل بوٹے کھلاتے رہیں، سجاتے رہیں اور ہم ان کے سخن سے فیض پاتے رہیں۔

نام کتاب: ادھ کھلا دریچہ/ مصنفہ: ارم زہرہ/ صفحات 240 قیمت: 400/ رائے: شاعر علی شاعر

---

محترمہ ارم زہرا کی مطبوعات کا سفر "چاند میرا منتظر" ناول سے شروع ہوا جس کی اشاعت لاہور سے ہوئی اور پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گیا۔ دوسری کتاب بچی کہانیوں کا مجموعہ "میرے شہر کی کہانی" کراچی سے منظر عام پر آئی جس کی کامیاب سیل جاری ہے۔

ان حقائق سے ثابت ہوتا ہے کہ ارم زہرا ایک کمرشلائز رائٹر ہیں اور فکشن کے قارئین ان کی کتابیں خرید کر پڑھتے ہیں۔ جب "ماہنامہ صائمہ ڈائجسٹ" کراچی کے ایک شمارے میں بہ طور شاعرہ ان کی تصویر کو ٹائٹل بنایا گیا تو ان کا شاعرانہ وصف بھی سامنے آ گیا۔ اب ان کے افسانوں کا مجموعہ "ادھ کھلا دریچہ" زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہونے جا رہا ہے۔ مجھے قوی اُمید ہے ان کے ناول "چاند میرا منتظر" اور بچی کہانیوں کے مجموعے "میرے شہر کی کہانی" کی طرح یہ افسانوی مجموعہ "ادھ کھلا دریچہ" بھی اچھا بزنس کرے گا اور فکشن لکھنے والوں میں ان کا مقام و مرتبہ متعین کرنے میں مددگار ثابت ہوگا۔

مجھے ارم زہرا کے ناول "دل کا شیش محل" کا بھی شدت سے انتظار ہے جو "ماہنامہ صائمہ ڈائجسٹ" کراچی میں قسط وار شائع ہوا ہے۔ آج کل موصوفہ اسی ناول "دل کا شیش محل" کی تکمیل میں مصروف ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے پانچ ناولٹ بھی ترتیب دے رہی ہیں جس کے مجموعے کا نام "رستے میں شام" رکھا گیا ہے۔ ارم زہرا کے اندر ایک اچھی شاعرہ بھی سانس لے رہی ہے۔ مستقبل قریب میں ان کا شعری مجموعہ "چاندنی ادھوری ہے" بھی منظر عام پر آنے کا منتظر ہے۔

نام کتاب: سانسوں میں رفو شام/ مصنف: حسن مسعود/ صفحات 144 / قیمت: 250/ رائے: خالد اقبال یاسر

---

حسن مسعود ایسے شعرا میں سے ہیں جنھیں پڑھ کر دامانِ غزل کی کشادگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ غزل اپنے مزاج میں ایک زنبیل جیسی ہے کہ اس میں ہر طرح کے جمالیاتی عناصر، منفرد اسالیب اور مختلف لفظیات سما جاتی ہیں اور مزید گنجائش پیدا ہو جاتی ہے۔ حسن مسعود کے شعروں میں تحریر ایک انوکھے ڈھنگ سے روشنی دیتی ہے۔ اس تحریر کے تلازمات اس کے اپنے ہیں اور ان کے درمیان ایک پراسرار سا معنوی اور ارتباط بھی موجود ہے۔ جو محسوس ہوتا ہے لیکن اسے بیان کرنے کے لیے خاص طرح کا ذوق اور تربیت درکار ہے۔ اس کرے پر یہی زمانہ کروٹ بدلے گا یا کوئی اور ہی زمانہ کسی اور کائنات میں اپنی پرتیں کھولے گا، تو حسن مسعود کے شعروں کی توضیح اس دور کی نسبت بہتر طور پر ہو سکے گی۔ اگر حسن مسعود نے اپنی تلاش تخلیقی، سرشاری اور وفور کے ساتھ اسی طرح جاری رکھی اور شہرت کی دیوی کی پرستش شروع نہ کر دی تو وہ جس طرح کی نیات اور جیسے زمانے کی تلاش میں ہے، ضرور پالے گا۔

نام کتاب: تمہارا شہر کیسا ہے/ مصنف: نیلما ناہید درانی/ صفحات 128 / قیمت: 250/ رائے: منیر نیازی

---

الفاظ کو ایک خاص ترتیب سے سوچنا اور لکھنا...... بحور و عروض و قوافی کا خیال رکھنا شاعری ہے۔ مگر شاعری ان پابندیوں کے سوا بھی ہوتی ہے اور شاید یہی اضافی صفت ہی شاعری کی مندرجہ بالا ترتیب کو شاعری بناتی ہے۔ یہ حسن خیال جو نامعلوم سے لفظوں میں آتا ہے اور دلوں پر اثر کرتا ہے اور ایک نئے معلوم کا سبب بنتا ہے۔ یہی اصل شاعری ہے۔ اس کے بغیر الفاظ محض الفاظ رہ جاتے ہیں۔ بے تاثیر، بے معنی...... زیادہ گہرائی میں سوچنے اور اسے بیان کرنے سے دور رس اور دیرپا شعر معرض وجود میں

آتے ہیں۔ جو انسانی زندگی میں ایک نیا رنگ پیدا کرتے ہیں اور اس کے مختلف شعبوں میں تبدیلیاں لاتے ہیں۔
شعر کا اصل یہ ہے کہ وہ جا کر دلوں کو محسوس ہوتا ہے۔ پھر اس کے مختلف پہلو دل و دماغ پر وا ہوتے ہیں۔ نیلما ناہید درانی کی کتاب "تمہارا شہر کیسا ہے" پر نظر پڑی تو لگا ایک مکمل اور نئی نظم مجھ پر اثر کر رہی ہے۔ اس کے بعد میں نے جب اس شاعرہ کو پڑھنا شروع کیا تو اس میں مبتلا ہوتا گیا۔ اس کے اشعار کا مطالعہ ایک خیال تازہ...... ایک نیا منظر اور ایک نئی آب و ہوا کا احساس تھا۔ ایک نامعلوم کی خبر تھی جو میرے ساتھ ساتھ رہی۔

نام کتاب: غزل غزل زندگی / مصنف: روحی کنجاہی / صفحات 224 / قیمت: 350 / رائے: ظفر اقبال

---

روحی کنجاہی ہمارے سینئر اور صاحب اسلوب شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ وقت نے ان کے فن کو پوری طرح پکا دیا ہے۔ روحی سہل ممتنع کہنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ اپنے اردگرد کی خبر اور احساس ان کا بنیادی وصف ہے۔ سیدھی بات کرتے ہیں جو ٹھک سے سینے میں جا لگتی ہے۔ تاہم ان کے فن کی وہ قدر ابھی تک نہیں کی گئی جس کے وہ مستحق ہیں۔ بھلا ایسے شعر کہنے والے کو کب تک نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟

نام کتاب: جھیل میں ستارے / شاعر: مختار جاوید / صفحات 160 / قیمت: 300 / رائے: حسن عسکری کاظمی

---

ضمیر جعفری نے جہلم کے بارے میں دو باتیں کہی تھیں۔ اول یہ کہ جہلم پاکستان کا بازوئے شمشیر زن ہے۔ اس خطہ زمین کا یہ اعزاز ہے کہ ہماری فوج میں بھرتی ہونے والے جوانوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ دوسری بات یہ کہی کہ جہلم گندم میں خود کفیل ہو نہ ہو مگر شاعری میں ہر اعتبار سے خود کفیل ہے۔ یقیناً یہاں شعر و ادب سے گہرے شغف کے نتیجے میں باکمال اور باذوق افراد اس شہر کی ادبی و علمی سرگرمیوں کا مرکز و محور ہیں۔ آدھی صدی پیشتر جب مصطفیٰ زیدی جہلم میں ڈپٹی کمشنر مقرر ہوئے۔ انہوں نے ادیبوں اور شاعروں کی کہکشاں ترتیب دی۔ رائٹرز گلڈ کا قیام عمل میں آیا تو جہاں دوسرے احباب نے اس کی رکنیت اختیار کی وہاں مختار جاوید بھی رائٹرز گلڈ کے ممبر بنے۔ ان کا عہد شباب تھا بلکہ یوں کہا جائے کہ لڑکپن انگڑائی لے کر ڈھل رہا تھا اور وہ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے والے تھے۔ ان کے ہاتھ میں قلم شمع کی لو کی طرح تھرتھراتا دکھائی دینے لگا۔ وہ خود کسی کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہوا چاہتے تھے لیکن جلد ہی یہ مراحل طے کرتے ہوئے مختار جاوید ایک پختہ کار، نغز گو شاعر بن کر جہلم کی ادبی مجالس کے مدار المہام کہلانے لگے۔ ان کے گھر پر شعری اور تنقیدی اجلاس باقاعدگی کے ساتھ ہونے لگے۔ یہ سلسلہ تادیر جاری رہا۔ یہاں تک کہ حلقہ ارباب ندیم کے تحت ان کے نئے گھر کہکشاں میں کل پاکستان مشاعرے منعقد ہوئے۔ ان میں احمد ندیم قاسمی تشریف لائے۔ مختار جاوید نے اسی گھر کے نام کی مناسبت سے ایک یادگار شعر کہا جو سفر کرتا ہوا پاکستان کے مختلف شہروں خصوصاً لاہور کے ادبی حلقوں میں ان کی پہچان بن گیا۔ ۔ آؤ مل کر اس زمیں پر کہکشاں ترتیب دیں .......... اک سے اک روشن ستارہ خاک میں موجود ہے
مختار جاوید کے اندر کی بستی کا آدمی خارجی دنیا کے ان مصنوعی شور و غل سے تنگ آیا ہوا لگیں ہے۔ اندر کے لوگ جب اپنی منڈیروں سے جھانکتے ہیں تو انہیں تضادات سے بھری ہوئی اس دنیا میں کوئی دلکشی نظر نہیں آتی۔ مگر کسی کی نظر اگر اس جھیل پر پڑ جائے جس میں مختار جاوید کی تخلیقی مسافتوں کے ستارے چمک رہے ہیں تو بے ساختہ وہ بے نیاز غم دنیا ہو کر اس جھیل میں ڈوب جائے اور ہمیشہ کے لیے امر ہو جائے!

نام کتاب: نظم اور نئی پنجابی نظم، تفہیم کے مباحث / مصنف: ڈاکٹر نوید شہزاد / صفحات 248 / قیمت: 350 / رائے: ڈاکٹر خواجہ زکریا

---

اس وقت دنیا بھر میں شاعری غیر روایتی اور لکیر سے ہٹ کر تخلیق ہو رہی ہے۔ اس میں تیسری دنیا کے مسائل تو ہیں ہی مگر یہ ترقی یافتہ دنیا کے بے شمار لوگوں کے مسائل کی بھی عکاسی کرتی ہے اور یہ مسائل اجتماعی بھی ہیں اور شخصی بھی۔ مارکسی اور وجودی فکر نے بے شمار لوگوں کو متاثر کیا اور پھر "وجودی مارکسی" فکر نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ چنانچہ نئی شاعری نے اجتماعیت اور انفرادیت کو ملا جلا کر ایک کر دیا ہے اور فرد کا ذاتی بحران اجتماعی بحران سے اس طرح مل جل گیا ہے کہ ان میں پہلی سی دوئی برقرار نہیں رہی۔

بے شک ہر زبان میں پرانی شاعری کی روایت سے استفادہ کرنے والے بھی ہیں لیکن بیسویں صدی نے جس پیچیدہ بین الاقوامی صورتِ حال سے فرد کو دوچار کیا ہے، اس کا اظہار شاعری میں روایتی اشکال واسالیب کو اپنا کر نہیں کیا جا سکتا۔ بیسویں صدی کے نصف آخر کا شاعر تشکیک، تنہائی، عدم اطمینان، بے یقینی کا شکار ہے، جس کے اسباب بے شمار ہیں اور ایک دوسرے سے یوں اُلجھے ہوئے ہیں کہ انہیں سلجھانا ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ دنیا کا ادب ان 'مڑے تڑے' خیالات سے نبرد آزما ہے اور ایک نئی شعری دنیا کی تخریب و تعمیر میں اُلجھا ہوا ہے۔ موجودہ پنجابی شاعری میں بھی کئی شعراء نے 'میکانکی شاعری' کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے اور اظہار کے نئے موضوعات واسالیب کی طرف پیش قدمی کی ہے۔ پنجابی شاعری کا یہ رجحان چونکہ گزشتہ رجحانات سے الگ ہے اس لیے اس کی تفہیم و تعبیر میں دقتیں پیش آ رہی ہیں۔ نئی نظم کے ان رجحانات کی پیچیدگی نے بہت سے مباحث کو جنم دیا ہے۔ ہمارے ہاں یہ مباحث اردو میں زیادہ اور پنجابی میں کمتر زیرِ بحث لائے گئے ہیں۔ ڈاکٹر نوید شہزاد نے اپنی تازہ تصنیف 'نظم اور نئی پنجابی نظم' میں ان مسائل کی تفہیم کے لیے ان تمام مباحث پر نظر ڈالی ہے جو ادھر اُدھر بکھرے پڑے ہیں لیکن مربوط انداز میں سامنے نہیں لائے گئے۔ ڈاکٹر صاحب پنجابی کے ساتھ ساتھ اردو کے بھی ایک وسیع المطالعہ نقاد ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اس سلسلے کے تمام اختلافی مباحث کا دلائل و براہین کے ساتھ جائزہ لی ہے اور بڑی جامعیت اور گہرائی کے ساتھ ان کا تجزیہ کر کے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ حسبِ ضرورت مروجہ آراء سے کھل کر اختلاف یا اتفاق کیا ہے اور نئی پنجابی نظم کے تمام نمائندہ شعراء کی شاعری پر نظر غائر ڈالتے ہوئے ان کا وہ کلام منتخب کیا ہے جو نئے اور پائیدار رجحانات کا آئینہ دار ہے۔ کتاب کے آخری حصے میں منتخب کردہ نظموں کے مختصر تجزیے ان کے نقطۂ نظر کو اور زیادہ واضح کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر نوید شہزاد نے شاعری اور تنقید کا براہ راست مطالعہ کیا ہے اور نتائج کے استخراج میں کسی کی تقلید کرنے کی بجائے اس آزادہ روی سے کام لیا ہے جو ایک اچھے نقاد کا حقیقی منصب ہے۔ پنجابی اور اردو دونوں زبانوں کے متجسس قارئین کے لیے اس اہم کتاب کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔

نام کتاب: اُردو دوہے / مصنف: ظہیر غازی پوری / صفحات 144 / قیمت: 300 / رائے: سید مبارک علی

---

ویسے تو اکثر شاعروں نے اُردو دوہے کم و بیش کہے ہیں مگر جن سخن وروں نے دوہے کو خصوصیت سے اپنایا ہے وہ چند ہیں۔ ان میں سے بھی ایسے دوہا نگاروں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے جن کے دوہوں کے مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ پاکستان کے حوالے سے دوہا نگاروں میں جمیل الدین عالی، طاہر سعید ہارون، جمیل عظیم آبادی، عرش صدیقی، خواجہ دل محمد، الیاس عشقی، رفیع الدین راز، تاج قائم خانی اور ہندوستان کے حوالے سے ڈاکٹر فراز حامدی، ابراہیم اشک، ڈاکٹر نادم بلخی، ناوک حمزہ پوری، بھگوان داس اعجاز، منذیر فتح پوری، اسلم حنیف، امن خیال، بے کل اُتساہی اور تاج سعید معروف دوہا نگار شامل ہیں۔

ظہیر غازی پوری نے اپنی کتاب "اُردو دوہے...... ایک تنقیدی جائزہ" میں دوہا نگاری پر اُن مضامین اور ناقدین کی آرا کو شامل کیا ہے جن پر تنقید کی گئی ہے، وزن، بحر، ماترائیں اور چھند کے سلسلے میں بحث ہوئی ہے۔ محترم جمیل الدین عالی اور رشید قیصرانی کی دوہا نگاری پر اس کتاب میں شامل دو بیانات پیش خدمت ہیں۔ باقی کتاب میں ملاحظہ فرمایئے گا۔ "وہ تمام اُردو دوہے جن کا فارم جمیل الدین عالی، پرتو روہیلہ وغیرہ کے کلام میں ملتا ہے۔ ماترائی مقدار اور لے کے اختلاف کے باعث دوہے کے میزان سے خارج ہیں۔ انھیں فردیابیت کہنا چاہیے۔"

نام کتاب: تریاق / شاعر: مظہر الحق / صفحات 190 / قیمت: 350 / رائے: وحید احمد

---

نوجوان شاعروں میں مظہر الحق کا تعلق اس قبیلے سے ہے جو اپنے عہد کی داستان لکھتا ہے۔ اس لیے وہ دیانت دار شاعر ہے۔ وہ اس زہر کی نشان دہی کرتا ہے جو گزشتہ کئی دہائیوں سے ہمارے رگ و ریشے میں سرایت کر رہا ہے۔ یہ تشخیص کرتے ہوئے اس کا لہجہ احتجاجی رنگ اختیار کرتا ہے۔ جذبے کی سان پر لفظ رگڑ کھاتے ہیں تو اظہار میں کاٹ شامل ہوتی ہے۔ وہ معاشرے کی جراحت کرتا ہے اور اس عمل میں اس کے ہاتھوں میں لرزش نہیں آتی۔ اس کے بعد وہ بقول غالب پرسش جراحت دل بھی اہتمام سے کرتا ہے۔ یعنی "سامانِ ہزار نمک داں کیے ہوئے" وہ سقراطی رستے پر چلتا ہے۔ زہر کا تریاق بھی زہر میں تلاش کرتا ہے۔ یوں علاج بالمثل کرتا ہے۔ اگر یوں کہتے ہوئے اس کے انداز میں کرختگی در آتی ہے تو یہ ایک قدرتی عمل ہے کیونکہ وہ معاشرے کے سامنے سخن کا آئینہ رکھتا ہے۔

نام کتاب: تازہ نعتیہ مجموعہ/ شاعر: ریاض ندیم نیازی/ رائے: خالد معین

---

''بحرِ تجلیات'' نامی یہ حمدیہ اور نعتیہ مجموعہ کلام معروف شاعر ریاض ندیم نیازی کا ہے جسے لاہور کے مشہور اشاعتی ادارے ''ماورا پبلشرز'' نے شائع کیا ہے۔ ریاض ندیم نیازی بلوچستان کے شہر سبی میں قیام پذیر ہیں اور تواتر کے ساتھ حمد، نعت، غزل اور نظم نگاری کر رہے ہیں۔ ان کی اب تک کئی کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں جن میں خوشبوترے جوئے کرم، ہوئے جو حاضر درِ نبیؐ پر (نعتیہ مجموعے) تمہیں اپنا بنانا ہے (مجموعہ غزل، نظم) اس طرح انہوں نے کچھ کتابیں تالیف بھی کی ہیں، جن میں نعتیہ اور غزل کے اشعار پر مشتمل اٹھارہ انتخاب کے علاوہ بچوں کے لیے دو کتابیں بھی شامل ہیں۔ اب ان کا یہ تازہ حمدیہ اور نعتیہ مجموعہ سامنے آیا ہے، حسبِ سابق اس مجموعے پر بھی کم و بیش بارہ معروف اہلِ قلم کے تاثرات موجود ہیں جن میں راجا رشید محمود، ماجد خلیل، اعجاز رحمانی، حسن اکبر کمال، عارف منصور، ضیا ثاقب بخاری وغیرہ نے ریاض ندیم نیازی کو ان کے پاکیزہ خیالات، عشقِ حقیقی اور عشقِ رحمتِ دو جہاں کی سرشاری کی داد دی ہے اور انہیں حمدیہ اور نعتیہ شاعری کو قرینے سے بیان کرنے پر شاباش دینے کے ساتھ اس راہِ پُر خار کی نزاکتوں سے بھی آگاہ کیا ہے۔ ''بحرِ تجلیات'' میں موجود حمدیہ اور نعتیہ کلام کی خاص بات، اس کی منفرد اور تازہ کار ردیفیں ہیں۔ مثلاً چراغ، ارتقا، یقیں، فروزاں، بحرِ تجلیات، گلی گلی، آئینہ، حرا، شہ کونینؐ اور ایسی ہی مہکتی اور تازہ تر ردیفیں تین سو باون صفحات پر مشتمل اس مجموعے میں موجود ہیں اور اپنی بہار دکھا رہی ہیں۔ یہ نئی ردیفیں دراصل دبستانِ وارثیہ کراچی کے تحت ہونے والے ردیفی مشاعروں کی دین ہیں جن کے مشاعرے کراچی کے علاوہ کوئی اور پورے پاکستان میں منعقد کیے جاتے اور بیرونِ ملک بھی ان مشاعروں کا سلسلہ جاری ہے۔ دبستانِ وارثیہ کے نعتیہ مشاعرے ایک تحریک کے طور پر بھی دیکھے جاسکتے ہیں اور ان مشاعروں میں ملک کے نامور شعرا نے عقیدت کے نذرانے سرکارِ دو عالم محمدؐ کی خدمت میں پیش کیے ہیں۔ اسی تحریک سے ریاض ندیم نیازی بھی متاثر ہوئے اور انہوں نے بھی تمام منفرد ردیفوں پر نعت کے ساتھ ساتھ حمدیہ اشعار بھی لکھے۔ یوں یہ ایک قابلِ قدر کاوش قرار دی جاسکتی ہے جو ایک باشعور قلم کار کی گہری عقیدتوں کے مہکتے ہوئے نذرانے سمجھے جاسکتے ہیں۔ اب جہاں تک ریاض ندیم نیازی کے طرزِ سخن اور مشاقی کی بات ہے تو انہوں نے واقعی ایک ایک حمد اور نعت میں اپنی جانب سے خلوص، جذبے، نیت اور شوق کے ساتھ عقیدت اور حضوری کی منزلیں طے کی ہیں۔ دعا ہے کہ ریاض ندیم نیازی اسی وفور اور جذبے کے ساتھ مزید اپنا یہ سفر جاری رکھیں۔

نام کتاب: تاراج/ شاعرہ: صوفیہ بیدار/ صفحات 160 / قیمت: 500 / رائے: خورشید رضوی

---

نارسائی کا ایک دائمی احساس، ہر سچے دل کی طرح، صوفیہ بیدار کا بھی مقدر ہے۔ تخیل کی خواہش جو ہمیشہ تشنہ تکمیل رہتی ہے، جذبے کا وفور جو اپنے اظہار کے لیے لفظ میں اپنا بدن تلاش کرتا ہے مگر اپنی کامل نمود میں ہمیشہ ناکام رہتا ہے۔ یہ اور ایسے ہی اور آتشیں متناقضات (Paradoxes) صوفیہ بیدار کے خواب اور بیداری کا حاصل ہیں۔ اُس کا فن اسی ''سوختنِ ناتمام'' سے عبارت ہے اور اسی لیے اُس کے اشعار میں وہ گرمی اور تاثیر ہے جو دل سے اُٹھ کر دل پر جاگرتی ہے۔ ایک قدیم روح صوفیہ کے پیکر میں بند ہے جو اپنی قدامت میں ہم عصر دنیا سے زیادہ تازہ و توانا ہے۔ اس کی غزل زندگی کی عمیق پرتوں سے اُبھرتی ہے۔ بتوں کی آنکھ میں جھلملاتا ہوا خواب اور اُس کی اوٹ میں کوئی رُکا ہوا منظر، ردائے چرخ میں ٹکے ہوئے ہجر کے ستارے اور سوت کاتتی خامشیاں...... یہ اور ایسی اور حساس تمثالوں کی ایک خواب ناک دنیا صوفیہ کی شاعری میں آباد ہے۔ ''تاجراج'' کے صفحات میں پھیلا ہوا ایک آئینہ خانہ ہمیں کھینچے لیے جاتا ہے اور عکس در عکس کی اُس لامتناہی فضا میں پہنچاتا ہے جو ہمیں اپنے گرد و پیش سے رہائی دے کر اس نادیدہ سرزمین کی طرف لے جاتی ہے جہاں خواب حقیقتوں سے زیادہ حقیقی ہیں۔

نام کتاب: اندھیرے میں جگنو/ ناول نگار: محمود ظفر اقبال ہاشمی/ صفحات 440 / قیمت: 900 / رائے: خالد شریف

---

میں نے محمود ظفر اقبال ہاشمی کا ناول ''سفید گلاب'' پڑھنا شروع کیا تو جیسے اس کے کرداروں نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا اور خوشبوؤں کا ایک ہالہ میرے ہر جانب رقص کناں محسوس ہوا۔ ''سفید گلاب'' نے وہ کیفیت طاری کی کہ آخری صفحے تک پہنچنے سے پہلے اس پر سے نظریں نہ اُٹھائی جاسکیں۔ ہاشمی صاحب نے سچ کہا کہ یہ ناول انہوں نے اپنے قلم سے روشنائی کی بجائے سچائی اور محبت بھر کر لکھا ہے۔ اب محمود صاحب کا دوسرا شاہکار ''اندھیرے میں جگنو'' طباعت کے مراحل طے کر کے آپ تک پہنچ رہا ہے۔ خوبصورت جذبوں میں گندھے ہوئے اس ناول کی تعریف کرنے کے لیے الفاظ کا چناؤ کرنا کارے دارد۔ یہ ناول نہیں ایک حیرت کدہ ہے۔ صاحبِ کتاب اپنی تحریر کے

ذریعہ ایک ایسا ماورائی ماحول تخلیق کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں کہ قاری صفحۂ اول سے صفحۂ آخر تک رنگ ونور کے سیل بے پایاں میں غلطاں رہتا ہے۔فواد کا کردار بینائی سے محروم ہونے کے باوجود دوسرے کرداروں کو اپنے قالب میں سموئے ہوئے ہے۔جگنو وہ روشنی ہے جو مستقبل کے خواب بنتی ہے۔شہرینا اور رابیل میں شعلہ وشبنم کا تناسب ہے۔رابیل زندگی، بندگی، ایثار اور وفا کی علامت ہے تو شہرینا اس دور نارسا پاس میں اندھی اور Self centred محبت کا اشاریہ ہے۔افروز سورج کی ایک ایسی کرن ہے جس کا کام ہی اندھیروں کو شکست دینے کے اسباب تلاش کرنا ہے۔غرضیکہ اس خوبصورت تحریر کا جو بھی ورق اُلٹیے ایک نیا جہانِ معنی نظر آئے گا۔

نام کتاب: نئی اُردو غزل/ مصنف: ڈاکٹر سرور الہدیٰ/ صفحات 496 / قیمت: 750 / رائے: شمیم حنفی

سرور الہدیٰ نے اردو کی ادبی اور لسانی روایت کا مطالعہ بہت توجہ کے ساتھ کیا ہے۔ وہ اپنے کلاسیکی سرمایے اور جدید میلانات کا یکساں شعور رکھتے ہیں اور عام نوجوانوں کی طرح اپنی ترجیحات کے معاملے میں عدم توازن کے شکار نہیں ہیں۔ان کی نئی کتاب ''نئی اردو غزل'' کی ورق گردانی کے دوران بھی اسی تاثر کی تصدیق ہوئی کہ اپنے ادبی اور تہذیبی ماضی وحال کی طرف ان کا رویّہ یکساں ذمہ داری کا ہے۔اس کتاب میں انھوں نے نئی غزل کے پس منظر اور اس کی موجودہ صورت حال پر نظر ڈالی ہے اور خاصی کشادہ قلبی کے ساتھ نئی غزل کی روایات کا جائزہ لیا ہے۔نئی غزل کے معماروں میں ناصر کاظمی، ظفر اقبال، احمد مشتاق، عرفان صدیقی سے لے کر ثروت حسین اور اکبر معصوم تک پرانے پن کے عناصر کسی نہ کسی سطح پر سب کے یہاں نمایاں ہوئے ہیں۔سرور الہدیٰ نے نئی غزل کے اس پہلو کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔اسی طرح نئی غزل میں شعری پیکروں کے واسطے سے خیال کی تجسیم کا جو رویہ بالخصوص، زیب غوری، شکیب جلالی، ظفر اقبال، مجید امجد اور احمد مشتاق کے یہاں ان کے طرز احساس پر حاوی دکھائی دیتا ہے۔اس کی تشریح وتعبیر میں بھی نئی غزل کی کامرانیوں کا ایک سلسلہ چھپا ہوا ہے۔اس مخصوص انداز کے سیاق میں بھی نئی غزل کا ایک اہم زاویہ سامنے آتا ہے۔وہ ادب کے نہایت سنجیدہ حساس اور باشعور طالب علم ہیں اور اپنی ادبی روایت کے پورے سلسلے کو ایک وسیع وعریض تاریخی سیاق میں دیکھنے کا ہنر رکھتے ہیں۔ بہر حال یہ ایک قابل مطالعہ کتاب ہے اور اُردو کی نئی غزل کا روپ رنگ خاصی وسیع وبسیط سطح پر سامنے لاتی ہے۔سرور الہدیٰ کے اسلوب تحریر میں کسی طرح کا اُلجھاؤ نہیں ہے۔وہ اپنی بات صاف، شگفتہ، موثر انداز میں کہنے کا سلیقہ رکھتے ہیں اور ادب کو ادب سمجھ کر پڑھنے کا سلیقہ بھی رکھتے ہیں۔دعا ہے کہ یہ ''مرحلہ شوق'' کبھی طے نہ ہو اور ان کی تلاش وتجزیے کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہے۔ان کی ہر تحریر کی طرح اس کتاب کی اشاعت سے بھی مجھے خوشی ہوئی ہے۔

اب اس کتاب ''نئی اُردو غزل'' کا ایک نیا روپ میرے سامنے ہے۔سرور الہدیٰ کی نظر ثانی کے بعد اور کچھ اضافوں کے ساتھ۔یہ بڑی خوبی کی بات ہے کہ سرور الہدیٰ اپنے مطالعے میں توسیع اور اضافے کے ساتھ ساتھ اپنے ادبی موقف اور ترجیحات کو بھی برابر پرکھتے اور آنکتے رہتے ہیں۔اس خوبی کی وجہ سے ان کی تحریروں میں ایک نئی طرح کی زندگی اور بیداری کا عنصر خود بہ خود پیدا ہو جاتا ہے۔مجھے وہ ہمیشہ ایک محتاط اور ذمے داری کے ساتھ اپنے ادبی رائیں قائم کرنے والے نوجوان نظر آئے۔اپنی اس کتاب میں بھی انھوں نے غزل کی صنف کے کلاسیکی ابعاد کے علاوہ نئی غزل کے کچھ ممتاز شاعروں کا احاطہ اس طرح کیا ہے کہ یہ کتاب پہلے سے زیادہ جامع اور ادب کے سنجیدہ قارئین کے لیے اب اور زیادہ کارآمد بن گئی ہے۔مجھے اس کتاب کی یہ شکل پسند آئی۔میرا خیال ہے کہ ادب میں نئی نظر، نئے خیال اور نئے تجربے کا خیر مقدم کرنے والے ہر قاری کو یہ اضافے وقیع محسوس ہوں گے۔

نام کتاب: نظریاتی تنقید (مسائل ومباحث)/ مصنف: ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی/ صفحات 256 / قیمت: 38 / رائے: ارژنگ

نظریاتی تنقید کو اس اعتبار سے اور بھی زیادہ اہمیت حاصل ہو جاتی ہے کہ بیسویں صدی کے اواخر سے ہی ساختیات اور مابعد ساختیاتی نظریات کی مقبولیت کے عمل نے تھیوری اور نظریے کی اہمیت میں غیر معمولی اضافہ کر دیا ہے۔چناں چہ تنقیدی نظریات کا الگ سے مطالعہ اپنے آپ میں بہت بامعنی عمل بن گیا ہے۔پھر یہ بھی ہے کہ اگر اطلاقی تنقید کے اس منظر کو زیادہ اہمیت نہ دی جائے جس کی بنیاد ادبی نظریات اور تنقیدی تصورات پر قائم ہوتی ہے تو اطلاقی تنقید ہوا میں معلق ہو کر رہ جاتی ہے۔اس مقصد کے حصول کے لیے مشرقی اور مغربی تنقید کے نئے اور پرانے نظری مباحث کے ساتھ بعض ممتاز تنقیدی دبستانوں کا تعارف بھی اس کتاب میں شامل کر دیا گیا ہے۔اس طرح زیر نظر کتاب محض اردو کے تنقیدی نظریات تک محدود نہیں رہی بلکہ علی الاطلاق ادبی تنقید سے متعلق نظریات وتصورات کی دستاویز بن گئی ہے۔

# نامہ ہائے احباب

عزیز از جاں عامر بن علی، حسن عباسی صاحب!

السلام علیکم۔ ارژنگ کا نیا حسن پارہ من بھاوتا ہے۔ اس کی جدتوں نے جی موہ لیا۔ سانحہ پشاور نے دل ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ ہمارے معصوموں کی جانوں پر ظالموں نے ایسی قیامت کھڑی کی ہے کہ سوچ سوچ کے دل بیٹھا جاتا ہے۔ سکول/کالج کے اساتذہ اپنے پیارے پیارے شاگردوں پر قربان ہو گئے اور قربانی کی ایک مثال قائم کر دی۔ شہیدوں کی یاد کی خاطر کربلا کے آنسو اور شام غریباں کی دعائیں درکار ہیں۔ اس غم سے اس قدر ٹوٹ پھوٹ گیا ہوں کہ نہ پڑھنا بھلا لگتا ہے نہ لکھنا لکھانا خوب۔ تاہم اس سانحے کے خصوصی کی ایک غزل بھیجتا ہوں۔ آپ ''ارژنگ'' کی عزت مجھے دیتے ہیں۔ مجھ پر ایک بڑا احسان کرتے ہیں۔

خیر اندیش

آصف ثاقب

---

عامر بن علی، حسن عباسی صاحب! سلام

ارژنگ ملا ہر اک صفحہ معیار اور جدت کی عکاسی کر رہا تھا۔ جو کہ آپ کی ادبی کاوشوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ میں آپ کا مشکور ہوں جو اس ادبی جریدے سے نوازتے ہیں۔ کسی دن مکمل تبصرہ لکھ بھیجوں گا۔ ابرار اور دوسرے دوستوں کو سلام کہیے گا۔ اب کے بار کچھ تازہ شاعری اور میری کتاب پر پروفیسر سکندر عباسی کی تحریر ارسال کر رہا ہوں۔ امید رکھتا ہوں کہ ارژنگ کے معیار پر پورے اتریں گے۔

آپ کا اپنا

عابد کاظمی

لاڑکانہ

---

حسن عباسی اور عامر بن علی صاحب! السلام علیکم

آج ہی محترم جناب ناز اوکاڑوی صاحب کی وساطت سے ارژنگ ملا۔ خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ معیاری کاغذ پر نہایت نفیس پرنٹنگ کا حامل پرچہ نہ صرف اپنے گٹ اپ میں معیاری ہے بلکہ تحریروں کے اعتبار سے بھی کسی بین الاقوامی رسالے سے کم نہیں ہے۔ سب سے منفرد چیز مختلف شہروں کی الگ الگ نمائندگی ہے۔ ہاں البتہ محترم جناب ریاض حسین زیدی کی طرح میں بھی یہ تجویز دوں گا کہ ادبی موضوع پہ مدیرانہ مضمون ضرور شامل کرنا چاہیے۔ ماں بولی پنجابی کا سیکشن رکھ کر بڑا عمدہ کام کیا۔ اس نفسا نفسی کے دور میں ایسے عمدہ ادبی رسائل نکال کر آپ واقعی ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ اللہ اجر عطا فرمائے۔

تنویر سیٹھی

وہاڑی

---

قابل احترام جناب حسن عباسی بھائی!

السلام علیکم۔ اُمید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔

فون پر بات ہوئی تھی۔ تازہ نعتیہ انتخاب ارسال خدمت ہے قبول فرمائیں۔ کچھ چیزیں پہلے بھی موجود ہیں۔ غزلیں ارژنگ میں گوشہ کے لیے اگر بہتر سمجھیں تو لگوا دیجیے گا۔ بہت شکریہ

اوکاڑوی صاحب کی خدمت میں آداب

برادر عزیز

ریاض ندیم نیازی

---

جناب ناز اوکاڑوی جی!

السلام علیکم۔ پانچ غزلیں ارژنگ کے ننکانہ صاحب کی نمائندگی کرنے کے لیے بھیج رہا ہوں۔

محمد انور زاہد صدر (وجدان)، رؤف شاہ جی پوری

محمد عمیر واصف (وجدان)، فرزند شائق،

عبدالرشید شاہد۔

اُمید ہے ننکانہ صاحب کا صفحہ لگا کر مشکور فرمائیں گے۔ ساتھ پنجابی حمد اور غزلیں بھی ہیں۔ پنجابی حمد میرے بیٹے محمد عدیل شاہد کی ہے یہ اس کی پہلی کاوش ہے۔ حوصلہ افزائی کرنا۔

عبدالرشید شاہد

---

حسن عباسی/جناب ناز اوکاڑوی صاحب

السلام علیکم۔ ماہنامہ ارژنگ دا نواں شمارہ اپنیاں ساریاں خوبیاں نال چھپ کے اکھراں دی خوشبو نال مہکدا اپڑیا۔ رسالے دا حسن تے رُوپ اگے نالوں ودھ کے اے۔ ہر لکھت دل نوں کھچ لین والی اے تے شعراں دیاں کلیاں اپنی خوشبوئی نال روح نوں سکون دیندیاں نیں۔ رسالے دی ساری ٹیم مبارک دی حق دار اے جیہڑی اینہوں سوہنا تے سواہرا بناون لئی دن رات کام کر رہی اے۔

قمر حجازی

اوکاڑا

---

برادرِ مکرم حسن عباسی! السلام علیکم۔

اُمید ہے مزاج شریف بخیریت ہوں گے۔

ارژنگ کا شمارہ ملا۔ پڑھ کر دلی مسرت ہوئی۔ بہت ہی عمدہ اور شاندار آپ کا میگزین دن بدن ترقی کی منازل طے کر رہا ہے۔ آپ کی تمام ٹیم کو مبارک باد۔ حسب وعدہ ٹیکسلا کے چند شعراء کا کلام حاضر خدمت ہے۔ قبول فرمائیں۔ دیر آید درست آید۔ تھوڑی دیر ہوگئی لیکن......

اللہ تعالیٰ آپ کو ارژنگ کو، تمام ٹیم کو، تمام پاکستانیوں کو تمام مسلمانوں کو سدا سلامت رکھے۔

آمین

آپ کی دُعاؤں کا محتاج

جابر نظامی

بوئی گاڑ، حسن ابدال

محترمی عامر بن علی حسن عباسی صاحب! السلام علیکم

آپ کی محبتوں کا بہت ممنون ہوں کہ آپ ''ارژنگ'' کے ذریعے کبھی کبھی یاد فرما لیتے ہیں۔

جنوری 2015ء کا شمارہ موصول ہوا۔ بہت بھرپور ہے۔ کچھ مصروفیات اور کچھ بدنصیبی کہ حاضری نہیں ہو پائی۔ سوچتے سوچتے وقت گزر جاتا ہے۔ جب کچھ بھیجنے بلکہ لکھنے کی طرف مائل ہوتا ہوں تو وقت گزر چکا ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔

آمین

بہت سی دُعائیں

شاکر کنڈان

حسن عباسی! جیتے رہو۔ پیار و دعوات۔

لاہور پی ٹی وی ہوم کے نعتیہ مشاعرے میں آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی اور آپ کا عمدہ کلام سننے کو نصیب ہوا جو نعت آپ نے عقیدتاً حضور اکرمؐ کے حضور پیش کی۔ یقیناً وہ گوہر نایاب ہیں۔ اللہ کریم اپنے حبیب کے صدقے ہماری بخشش فرمائے آمین

آپ کا اور عامر بن علی کا ارژنگ ہر ماہ تسلسل سے مل رہا ہے۔ میں نے 2014ء دسمبر تک اپنے دو شعری مجموعے اردو شاعری ''اس کی پھوہار'' اور نعتیہ مجموعہ کلام ''ریاض نظر'' جو تیار ہو چکے ہیں مرتب کرنے میں مصروف رہی۔ اب انشاء اللہ فراغت نصیب ہوئی ہے۔ یہ میرے چوتھے اور پانچویں مجموعہ ہائے کلام ہیں۔ میری تخلیقات میں (۱) پانی کا گھر پہلا ایڈیشن

اُردو شاعری (۱) پانی کا گھر 2008 دوسرا ایڈیشن (ساہیوال پبلی کیشنز) (۲) روشنیوں کے رنگ 2011ء جمہوری پبلی کیشنز (۳) یادوں کی بارش 2013ء جمہوری پبلی کیشنز (۴) اُس کی پھوہار 2015 جمہوری پبلی کیشنز لاہور (۵) نعتیہ کلام ریاض نظر 2015 عنقریب پریس میں چلی جائے گی۔ کمپوز ہو چکی ہے۔

میری شاعری میں عمر 1960 سے تقریباً 54 برس کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں۔ بس ایک غزل اور ایک نعت آپ کے رسالے کی نذر کرتی ہوں۔ غزل تازہ ترین مجموعہ کلام میں ''اُس کی پھوہار'' سے لی گئی ہے جو ابھی آپ کی نذر نہیں ہوا۔ اُمید ہے میرا کلام جو تمام لوازمات شعری اور ہر قسم کی خوبیوں سے آراستہ و پیراستہ ہے آپ کے رسالے کی زینت بننے کے لیے حاضر ہے۔ سابقہ تاخیر کی معذرت اور آئندہ انشاء اللہ بغیر تاخیر کے کلام ارسال کرتی رہوں گی۔

جب بسمل کو زمانے نے تنہائی کے اندھیروں میں پھینک دیا تو اس نے اپنی ذات میں ایک انجمن قائم کر لی اور نہایت سنجیدگی سے عرفانِ ذات کے سفر پر رواں ہو گئی۔ 1998 میں پانی کا گھر کی پذیرائی سے جو رنگ اُبھرے وہ روشنیوں کے رنگ میں منتقل ہو گئے۔ پھر ان رنگوں میں ڈوب کر جو دھواں دھار بارشیں ہوئیں وہ یادوں کی بارشوں میں 2013 میں پیش کر دیں۔ اب 2015 میں اس کی پھوہار جس کی بھینی بھینی خوشبو نے میرے قریۂ جاں کو معطر کیا قارئین کو پیش ہے۔ اُمید ہے میرے مجموعے جو میرا سرمایۂ حیات ہیں مجھے قارئین کرام سے بہت پذیرائی ملی جس کے لیے تہِ دل سے شکر گزار رہوں۔

بسمل صابری

ساہیوال

محترم جناب حسن صاحب/ تازہ وکاڑوی صاحب

السلام علیکم۔ خیریت سے ہوں گے۔ خدا آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین

جنوری 2015 کا شمارہ ملا۔ آپ کی محبت کو سلام پیش کرتا ہوں۔ فوری طور پر میگزین کی خوبصورتی پر دل خوش ہو گیا۔ ٹائٹل ہر مرتبہ اچھے ذوق کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس دفعہ بھی معصوم سے بچے کی تصویر نے ٹائٹل کو خوبصورت کر دیا۔ نستعلیق مطبوعات کو پیش کرنے کا انداز بہت عمدہ ہے۔ گل نوخیز اختر کی گفتگو بھی عمدہ ہے۔ حمد و سلام بھی معیاری ہے۔

افضال سہروردی کا انتخاب بھی خوبصورت ہے۔ عطاء الحق قاسمی کی شگفتہ تحریریں متاثر کرتی ہیں۔ اس مضمون میں انہوں نے دوستوں کا حق دوستی ادا کر دیا۔ رُخسانہ سحر کی غزل کا شعر:

یہ جرات نگاہ کسی اور میں نہیں
سورج کو دیکھ آنکھ دکھانے لگی ہوں میں

''ہمیشہ دیر کر دیتی ہوں'' صغرا صدف کا مضمون ذہن کے دریچے کھول دیتا ہے۔ ابرار ندیم کا مضمون پسند آیا۔ محمد افتخار شفیع نے افضال سہروردی کے بارے لکھ کر ہمیں ان کا بھرپور تعارف کروایا ہے۔ ذکر شہ والا، ریاض حسین زیدی صاحب کی خوبصورت نعتیہ کتاب ہے جس پر تبصرہ ارسلان احمد ارسل نے لکھا ہے۔ عالمی شاعری میں ثاقب علی ساقی، آصفہ نشاط، سلطان مہر، محسن بھٹی، ندا فاضلی، شکیل سروش اور مونا شہاب کا کلام بہت عمدہ ہے۔

انڈیا سے عرفان صدیقی، یاسمین حبیب، بحرین سے محمد ریاض شاہد، فرانس سے ایاز محمود ایاز، اسد رضوی، کویت سے بدر سیماب، خالد سجاد، مسرت جبیں زیبا، کینیڈا سے تن دیپ تمنا، قطر سے فرتاش سید، عمان سے ناصر معروف، صدف زبیری، قمر ریاض اور ناروے سے جمشید مسرور کی شاعری نے متاثر کیا۔ لاہور سے صغرا صدف، عمران شناور، سرور ارمان، باقی

احمد پوری، صابر ظفر، حجاب عباسی، دانیال طریر، قمر رضا شہزاد، گلفام نقوی، نصرت صدیقی کا کلام عمدہ ہے۔ حسن عباسی صاحب کا بھارت یاترا بھی دلچسپ تحریر ہے۔ ساہیوال سے ایز د عزیز، علی رضا، شیخوپورہ سے عزت مآب شاہین عباس کا کلام پسند آیا۔

اوکاڑہ سے شامی، شبانہ زیدی اور عاکف عثمان بہاول نگر سے عامر سہیل، میاں چنوں سے فاروق طراز، عامر بن علی نے خوش کلامی سے متاثر کیا۔ شاعر علی شاعر اور رفیع الدین راز واقعی بہت عمدہ کلام لکھتے ہیں۔ عامر بن علی کا یہ شعر خوب ہ:

حسن اور حکومت سے کون جیت سکتا ہے
یہ بتاؤ دونوں کی عمر کتنی ہوتی ہے

تقاریب کا تعارف بھی دلچسپ ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر ارژنگ کے تمام مضامین معیاری ہیں۔ شاندار پرنٹنگ اور خوبصورت تزئین نے آپ کے ارژنگ کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ پوری ٹیم کو مبارک باد

والسلام

محمد امین انجم

اوکاڑا

جناب حسن عباسی جی، عامر بن علی صاحب!

السلام علیکم۔ ''ارژنگ'' مسلسل مل رہا ہے۔ آپ کی محبت ہے کہ آپ شمارہ بھی بھیجتے ہیں اور کلام بھی چھاپتے ہیں۔ ارژنگ ترقی کی منازل طے کرتے کرتے ایک معیاری اور خوبصورت رسالہ بن گیا۔ جس کے پیچھے آپ کی محنت کا اس ار اعمل دخل ہے اور آپ کی پوری ٹیم بھی خلوص نیت سے آپ کے ساتھ کام کر رہی ہے۔ ایک نعت اور پنجابی غزل بھیج رہا ہوں پسند آئیں تو قریبی اشاعت میں شامل کریں۔

مخلص

غزالی/گوجرہ

جناب حسن عباسی صاحب! آداب

اُمید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ ماہنامہ ارژنگ مل گیا۔ بے حد شکریہ یہ بہت شاندار رسالہ ہے۔ بہت کچھ ملا۔ آپ کا انتخاب بھی بہت عمدہ ہے۔ مگر شاعری کے حوالے سے آپ کی کمٹمنٹ خوب ہے۔ عالمی شاعری، ملکی شاعری، متفرق نظمیں، پنجابی حصہ، مضامین، افسانے غرض کہ سب کچھ ہی لائق تحسین ہے۔ آپ کی کاوشیں قابل قدر ہیں۔ شاعروں کے گوشے کے حوالے سے میں جلد اپنی کچھ غزلیں بھیجوں گی۔ ابھی ایک چھوٹا سا افسانہ اور ایک غزل پیش خدمت ہے۔

عامر بن علی صاحب سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ بہت عمدہ شخصیت ہیں اچھے رائٹر بھی ہیں۔ اللہ انہیں سلامتی عطا کرے۔ فیس بک پر تو خیر ملاقات رہتی ہی ہے۔ خوش رہیں۔

آسناتھ کنول

لاہور

برادرم حسن عباسی وارکان ارژنگ

السلام علیکم۔ اُمید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔

ماہ جنوری ۱۵ء کا ''ارژنگ'' موصول ہوا۔ دیکھ کر دل خوشی سے اُچھل پڑا۔ نئے سال کا پہلا دفعہ آپ کی طرف سے ملا۔ سب سے پہلے تو ٹائٹل پر زبردست داد وصول کریں۔ بہت ہی منفرد انداز کا حامل آرٹ ورک کا دلکش نمونہ آپ نے پیش کیا۔ اس کے بعد اندرونی صفحات کی تو کیا بات ہے۔ ارژنگ کا یہ نیا انداز بے حد بھایا۔ صفحات میں بھی اضافہ اور معیار میں مزید اضافہ ہوا۔ اگرچہ پہلے بھی کم معیاری نہیں تھا۔ شاعری کے لیے الگ الگ ملکوں اور شہروں کے صفحات مختص کر کے ایک جدت پیدا کی گئی ہے جو قابل ستائش ہے اور اس میں بہت اچھی شاعری پڑھنے کو ملی۔ گوشے بھی بہت خوب رہے۔ خاص طور پر عشرت آفرین، ناصر معروف، احسان شاہد، شمشیر حیدر، شاعر علی شاعر اور رفیع الدین راز کے گوشے بہت پسند آئے۔ نثری تحریروں میں عطاء الحق قاسمی، پروفیسر عاشق رحیل، صغریٰ صدف نے تو احمد عقیل روبی کے بارے میں اتنے جذباتی تاثرات لکھ کر مجھے رلا دیا اور روبی صاحب کے ساتھ گزرے وہ ۸ سال یاد آگئے جن میں ہر دن ان سے ملاقات ہوتی اور کئی کئی گھنٹے ان کی گفتگو کے سحر سے نکلنا مشکل ہو جاتا۔ گل نوخیز سے عامر بن علی اور ڈاکٹر جعفر حسن مبارک سے آپ (حسن عباسی) کے انٹرویز بھی بہت اچھے لگے۔ روبنسن سیموئل گل نے بھی اپنا اپنا لطف دیا۔ جبکہ اس بار افسانوں کی تعداد کم ہے۔ آخر میں صفحہ آخر یعنی بیک ٹائٹل کی بات ہو جائے۔ یقین جانیں جاپان کے بارے میں اس طرح کی تحریری تصاویر پڑھ، دیکھ کر میرا خون بڑھ گیا کہ اُردو زبان کا جادو ہر طرف چھایا ہوا ہے۔ عامر بن علی نے یہ تصاویر اُتار کر اور شائع کروا کر بہت بڑا کام کیا ہے۔ مجھے تو یہ چینی مصور ارژنگ کے فن پاروں سے بھی قیمتی شاہکار لگے ہیں۔ ایسے دعا کے آئندہ بھی کرتے رہیے گا۔ اس قدر معیاری ادبی جریدہ نکالنے پر ارژنگ کی پوری ٹیم کو بہت بہت مبارک باد اور پرخلوص سلام قبول ہو۔

خیر اندیش

آفتاب خان

لاہور

نامور مزاح نگار ، کالم نویس اور شاعر

# ڈاکٹر سلیمان عبداللہ ڈار

سے حسن عباسی کی گفتگو

● اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں بتائیں؟

● میرے خیال میں تو ابھی زندگی شروع ہی نہیں ہوئی میں چاہتا تھا اردو ادب میں ایم فل یا پی ایچ ڈی کروں یونیورسٹی میں چھوٹا سا گھر ہو میں زیادہ امیر نہ بھی ہوتا مگر گھر کے دروازے پر عشق پیچاں کی بیل ہوتی میں پنجاب یونیورسٹی میں نہر کے کنارے بیٹھ کر غزلیں ، نظمیں اور افسانے لکھتا۔ ابتدائی زندگی علی پور چٹھہ ضلع گوجرانوالہ میں گزری گوجرانوالہ سے ایف ایس سی کی۔

● آپ نے ادبی زندگی کا آغاز کس صنف سے کیا؟

● گوجرانوالہ میں ایف ایس سی کے دوران ہمارے اردو کے اساتذہ نے اردو ادب سے ایسی محبت دل میں پیدا کی کہ غزل لکھنا شروع کی اساتذہ سے اصلاح لیتے رہے کالج کے مجلّہ میں شائع ہوتے رہے۔

● ابتداء میں کس سے متاثر تھے؟

● کم سنی میں ہی شفیق الرحمٰن اور دوسرے مزاح نگاروں کو پڑھا ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا گھر میں اخبار نہیں آتا تھا۔ گلی کی نکڑ پر ایک ٹی اسٹال سے نوائے وقت پڑھتا خصوصاً ''روزن دیوار سے'' ایف ایس سی میں مزاحیہ مضامین لکھے۔ شفیق الرحمٰن اور عطاء الحق قاسمی صاحب کی تحریریں تو

**شعروادب کی ترویج میری زندگی کا مقصد ہے**

بس جکڑ لیتی تھیں۔ لڑکپن میں عبدالحمید عدم کو بڑی محبت سے پڑھا شاید اس لئے بھی کہ وہ ہمارے قریبی قصبہ تلونڈی موسیٰ خاں کے تھے۔

## بے ساختہ مزاح لکھنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں اسی لئے اس صنف میں کم لکھا جارہا ہے

● شعروادب کی طرف رجحان کیسے پیدا ہوا؟

● بچپن میں ہی کھیل کود کا کوئی شوق نہ تھا میری کوئی ہم نصابی سرگرمی نہ تھی میرے بھائی غضب کے کرکٹر اور فٹ بالر تھے مگر میں نے کبھی کوئی گیم نہ کھیلی بس رسائل لے کر پڑھتا تھا یا محلے کی ''آنہ'' لائبریری سے بچوں کی دنیا لے کر پڑھتا تو بہت انجوائے کرتا۔ ایف ایس سی میں مرقع اردو نے ایک ایسا دلبستگی کا سامان بہم پہنچایا کہ یہ درسی کتاب پوری کی پوری یاد تھی ایک بار کوئی شعر یا نظم سنتا تو اسی وقت ہو بہو ساری غزل یا نظم زبانی سنا دیتا کالج میں مجھے ٹیوٹوریل گروپ کا جنرل سیکرٹری بنا دیا گیا جہاں میں ہر ہفتے اپنی تازہ غزل سناتا جس کی اصلاح میں اپنے اردو کے پروفیسر صاحب سے کروالیا کرتا تھا والدِ گرامی کالج آتے تو اساتذہ سے کہتے کہ میں تو بیٹے کو ڈاکٹر بنانا چاہتا ہوں آپ اسے شاعر بنا رہے ہیں میں نے تو شاعروں کو بھوکے مرتے ہی دیکھا ہے میرے پروفیسر مسکرا کر اباجی سے کہتے ''آج کل تو کروڑوں اربوں میں کھیلنے والے شاعر اور ادیب موجود ہیں۔''

● شاعری میں آپ کس صنف میں لکھتے ہوئے سہولت محسوس کرتے ہیں۔

● پچھلے پچیس سال سے مزاح لکھ رہا ہوں اردو ادب میں مزاح لکھنے والے ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں مزاح لکھنا مشکل گردانا جاتا ہے لیکن مجھے اس سلسلے میں کبھی ذہنی یا قلبی دقت محسوس نہیں ہوئی پچھلے دس سال میں اللہ والوں کے ساتھ بیٹھنا نصیب ہوا میں حضرت واصف علی واصفؒ سے ان کی زندگی میں ملتا رہا۔ نثر پاروں پر مشتمل میری کچھ کتب بھی شائع ہوئیں منہ اور قلم کا ذائقہ بدلنے کیلئے نظم اور غزل بھی لکھی سفرنامے بھی لکھے لیکن سہولت فقاہیہ تحریر ہی میں نظر آتی ہے ویسے بھی ایک مسکراہٹ نفرتوں کے پہاڑ کو ریزہ ریزہ کرسکتی ہے تو سوچتا شاید میری تحریر بھی کسی قاری کی زندگی میں یہ معجزہ برپا کرسکے!

**ادیب قوم کی سوچ کا رخ موڑ سکتا ہے**

● موجودہ دور میں ادیب کی کیا ذمہ داری بنتی ہے؟

● ادیب معاشرے کا نباض ہوتا ہے ایک Committed ادیب کو اپنی نسل اور قوم کے نوجوانوں کی ذہنی قلبی روحانی معاشرتی اور سیاسی بیداری کے لئے آبیاری کرنا ہوگی۔

(بقیہ اندرونی صفحات پر)

ادارہ وجدان کے زیر اہتمام

# سال نو مشاعرہ وظہرانہ

صدارت : خالد اقبال یاسر

مہمانانِ خصوصی: عامر بن علی • ڈاکٹر سید انوار احمد | مہمان اعزاز : امجد اسلام امجد | نظامت : عدیل برکی • ڈاکٹر صغریٰ صدف

Gull
Design By:
MUHAMMAD AHSUN

Read Arxang Online
www.amirbinali.com
www.millat.com